ISSN 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن

قیمت: ۲۵/روپے

دسمبر ۲۰۲۰ء تا فروری ۲۰۲۱ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ

حکومت اتر پردیش کا واحد ادارہ ہے جو ملک گیر سطح پر اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ ادارہ اپنے قیام سے اب تک بڑی تعداد میں مسودات کی اشاعت میں مالی امداد فراہم کر چکا ہے۔ کمیٹی کی اہم سرگرمیوں کی تفصیل ذیل میں پیش ہے۔

۱۔ مسودات کی طباعت/ اشاعت پر مقرر کردہ ضابطہ کے مطابق %75 تک مالی امداد دی جاتی ہے جس کے لئے مقررہ درخواست فارم بھرنا ہوتا ہے۔

۲۔ اردو/عربی/ فارسی کے لئے پی ایچ ڈی/ ڈی لٹ اسکالرس کے تحقیقی مقالہ کی کمپوزنگ پر مالی امداد

۳۔ فخرالدین علی احمد کے نام سے منسوب گولڈ مڈل اسکیم کے تحت ملک کی تمام یونیورسٹیوں سے ایم اے/بی اے اردو/عربی/ فارسی میں امتیازی نمبر پانے والے طلبا و طالبات کو حسب ضابطہ -/15000 (پندرہ ہزار روپے صرف) کی رقم بطور فی اسکالر منظور کی جاتی ہے۔

۴۔ اردو کی ترویج و ترقی اور قومی یکجہتی کو بڑھاوا دینے کے لئے مختلف تقاریب کے انعقاد کے ساتھ ساتھ فخرالدین علی احمد یادگاری خطبات و ادبی سیمینار وغیرہ کا انعقاد کرانا۔

۵۔ ادبی سرگرمیوں سے متعلق سہ ماہی خبر نامہ کی اشاعت

یہ ادارہ آپ حضرات کے تعاون اور ذاتی دلچسپی سے روبا عمل ہے۔

اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی سے متعلق اگر آپ کے ذہن میں کوئی اسکیم ہو تو اس سے ہمیں مطلع فرمائیں۔

کمیٹی اس کا خیر مقدم کرے گی۔

مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں

ایس رضوی

(سکریٹری، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی) اردو اکادمی بھون، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ

فون دفتر: 0522-2306040

Website: www.faamc.org Email: fakhruddincommeetti@gmail.com

دسمبر ۲۰۲۰ء تا فروری ۲۰۲۱ء
ISSN 2581-5482
جلد : ۴
شمارہ : ۱

سہ ماہی
ادبی نشیمن

ADBEE NASHEMAN

Email
adbeenasheman@gmail.com

قیمت

فی شمارہ	:	۲۵/روپے
سالانہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک	:	۱۲۵/روپے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک)	:	$ 15 (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	دو ہزار روپے
لائبریری/ادارہ کیلئے	:	۶۵/روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ
سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ 226003

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Allahabad Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No. : 50489096237
IFSC : ALLA0212170

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168, Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد
Mob.: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com

ادبی مشیر

رفعت عزمی
Mob.: 9451818310
rafatsafavi@gmail.com

مجلس ادارت

- ڈاکٹر غلام حسین (اجین)
- ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
- ڈاکٹر شکیل احمد (مئو)
- ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
- وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)

تزئین کار: وقار حسین رضوی

'ادبی نشیمن' میں شائع ہونے والے تمام مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی ساری ذمہ داری مصنف کی ہوگی۔ ادارے کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارود خانہ، گولہ گنج، لکھنؤ سے چھپوا کر 168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست عناوین

آغاز

۱	حمد باری	آزادضمیرانصاری	۳
۲	نعت	محمدزاہدرضابنارسی	۳

اداریہ

۳	نظریہ	ایڈیٹر	۴

گوشۂ گلزار دہلوی

۴	دبستان دہلی کا آخری سخنور: گلزار دہلوی	ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن	۷
۵	گلزار دہلوی: کوئی بتلائے مرے شعر میں میرا کیا ہے	ڈاکٹر مشتاق صدف	۱۱
۶	کاغذ آتش کدہ: گلزار دہلوی کا غزلیہ متن	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۱۵
۷	گلزار دہلوی: شعلہ کہ شبنم	ڈاکٹر قسیم اختر	۲۰
۸	گلزار دہلوی: شخصیت اور خدمات	نیلوفر شعیب	۲۴
۹	گنگا جمنی تہذیب کا حسین سنگم: گلزار دہلوی	وجاہت فاروقی	۲۷
۱۰	مشترکہ تہذیب و انسانیت کے علمبر دار پنڈت آنند موہن	ڈاکٹر راحت حسین	۲۹

گوشۂ راحت اندوری

۱۱	راحت اندوری کی شاعری میں سیاسی آگہی و شعور	سلیم انصاری	۳۳
۱۲	گونج خاموش ہوئی	ڈاکٹر اسراراللہ انصاری	۳۶
۱۳	مشاعرے کی دنیا کا محبوب ترین شاعر: ڈاکٹر راحت اندوری	ڈاکٹر داؤد احمد	۴۰
۱۴	راحت اندوری: انانیت کا شاعر	ڈاکٹر آفتاب عرشی	۴۵
۱۵	زیب غوری و راحت اندوری کی دو منفرد غزلیں	ڈاکٹر امین احسن	۴۸
۱۶	عوامی اقدار و احساسات کے انقلابی شاعر: ڈاکٹر راحت اندوری	ڈاکٹر احمد علی جوہر	۵۲
۱۷	ڈاکٹر راحت اندوری اپنے کلام کی روشنی میں	سیفی سرونجی	۵۷
۱۸	عصری حسیت کا نمائندہ شاعر: ڈاکٹر راحت اندوری	آصف پرویز	۵۹
۱۹	شہسوار اقلیم شعر ڈاکٹر راحت اندوری	ڈاکٹر محمد چاند نظامی	۶۲
۲۰	مالوہ کی ماٹی کا شیر: راحت اندوری	استوتی اگروال	۶۶
۲۱	حق گوئی و بیباکی کا نقیب: راحت اندوری	سفیان احمد انصاری	۶۹

منظومات

۲۲	چند رباعیاں بیاد گلزار دہلوی	ڈاکٹر عبدالحق امام	۶
۲۳	قالب راحت سے مل گئی	مرغوب اثر فاطمی	۳۲

مراسلات

۲۴	خطوط	ادارہ	۵۶

❑❑❑

آزادؔ ضمیر انصاری

حمد باری

خدا واحد احد ہے، یہ عقیدہ ہے مسلماں کا
رہیں ہم شرک سے بچ کر تقاضا ہے یہ ایماں کا

مبرّا ہے وہ شرکت سے وہی ہے قادرِ مطلق
وہی ہر جسم کا مالک وہی حاکم ہے ہر جاں کا

نہ ہو چشم کرم اس کی ،تو بگڑی بن نہیں سکتی
گدا ہو یا غنی،محتاج ہے توفیقِ یزداں کا

نسیمِ جانفزا ہے حکم سے اس کے خرامیدہ
اسی کی حمد پڑھتا ہے اک اک پتّہ گلستاں کا

اسی کے لطف سے سب کشتیاں ساحل سے لگتی ہیں
اسی کی مہربانی رخ پلٹ دیتی ہے طوفاں کا

نہ دیتا بھیک داتا نور کی جو اپنی رحمت سے
منوّر ہو نہیں سکتا تھا چہرہ ماہ تاباں کا

اگر اس کی مشیّت ہو،خزاں کا قہر برپا ہو
کرم سے رشکِ جنت رنگ ہو صحنِ گلستاں کا

رہے سرگرم خامہ عظمت وتمجید باری میں
یہی ہے فرض عین واوّلیں ہر اک سخن داں کا

وہی ہے حاضر وناظر وہی فریاد رس بھی ہے
وہی مشکل کشا آزادؔ ہے اپنے ثنا خواں کا

محمد زاہدؔ رضا بنارسی

نعت

عقیدہ یہی ہے یہی جانتے ہیں
مرا حال میرے نبیؐ جانتے ہیں

غلام نبیؐ کی غلامی جو پائی
اسی کو تو ہم سروری جانتے ہیں

وہ کرتے نہیں باغِ جنت کی باتیں
جو شہر نبیؐ کی گلی جانتے ہیں

جسے دیکھ کر خود خدا یاد آئے
اسی کو خدا کا ولی جانتے ہیں

خدا کی قسم نعت پاک نبیؐ کو
دل و روح کی تازگی جانتے ہیں

بچانا ہے دین محمدؐ کو کیسے
یہ فرزند مولا علیؑ جانتے ہیں

کہا حد سدرہ پہ جبریل نے یہ
اب آگے حضور آپ ہی جانتے ہیں

ہمیں عشق حسنینؑ ہے اور ہم تو
جہنم سے خود کو بری جانتے ہیں

ہے زاہدؔ غلام رسول مکرم
کہو یارو یہ ہم سبھی جانتے ہیں

نظریہ

۲۰۱۹ اور ۲۰۲۰ کے دورانیے میں کووڈ ۱۹ جیسی وبا نے ملک کی ایسی ایسی سیاسی، سماجی ،صحافتی اور ادبی شخصیتوں کو اپنی آغوش میں لے لیا جس پر ملک و بیرون ملک کے عوام کو ناز تھا۔ انھیں شخصیتوں میں گلزار دہلوی اور راحت اندوری کا نام بھی شامل ہے۔ یقینا اردو ادب کے لیے ان دونوں شخصیتوں نے جو چھاپ چھوڑی ہے اسے ایک طویل عرصے تک فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

گلزار دہلوی کی شناخت صرف مشاعروں یا شاعری کے حوالے سے نہیں ہوتی بلکہ وہ بلند پایہ شاعر کے علاوہ ادیب ،صحافی اور شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ تھے تو وہ کشمیری پنڈت مگر دہلی کی بو باس ان کے اندر رچی بسی تھی۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار اور مشاعروں کی شان تھے۔ مشاعروں میں انکی شمولیت مشاعرے کے کامیاب ہونے کی غماز ہوا کرتی ۔گلزار دہلوی کو شاعری اپنے والدین سے ورثے میں ملی ۔ان کے والد پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی اور والدہ برج رانی زتشی بیزار دہلوی بھی شاعرہ تھیں ۔گھریلو ماحول اور والدین کی تربیت میں گلزار کی پرورش پرداخت ہوئی۔ کہنہ مشق شاعر کے ساتھ ہی وہ کامیاب صحافی اور حکومت ہند کی جانب سے شائع ہونے والا رسالہ ’’سائنس کی دنیا‘‘ کے ایڈیٹر بھی تھے ۔تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا۔ انھوں نے منفرد لب ولہجہ کے شاعر کے طور پر اردو دنیا میں اپنی پہچان بنائی ۔’’ گلزارِ غزل‘‘ اور’’ کلیات گلزار دہلوی‘‘ ان کی بیش قیمتی مطبوعات ہیں ۔اردو ادب کی بقا اور ترقی میں ان کے کارہائے نمایاں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

گلزار دہلوی کی طرح راحت اندوری صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ مصور بھی تھے انھوں نے معروف آرٹسٹ مقبول فدا حسین کے زیر سایہ متعدد فلموں کے پوسٹر بنائے۔ لیکن شاعری ان کی اولین ترجیحات میں شامل تھی ۔ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ پہلے وہ معاشرے کے ہر پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں پھر شعر کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری میں حقیقت اور سچائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انکی شاعری کا کلیدی موضوع مجبوری، ناانصافی ،تاناشاہی ،سیاست اور ظلم و بربریت کے خلاف ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ شاعری میں ان تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں جس کا تعلق براہ راست عوام سے ہوتا ہے۔ ۱۹۷۵ میں برکت اللہ یونی ورسٹی بھوپال سے ’’اردو ادب میں مشاعرہ‘‘ پر انھیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ کچھ عرصہ تک معلم بھی رہے۔ ملک کے علاوہ بیرونی ممالک کے مشاعروں میں ہندوستان کا پرچم بلند کیا۔ ان کا کلام پڑھنے کا انداز سب سے نرالا تھا الفاظ کی ادائیگی اور اشعار کی ہیت کے ساتھ ان کے چہرے کا تاثر ،آواز کا زیر و بم اور حرکات سامعین کو مسحور کر دیتی۔ انھوں نے آشنا،صنم ،خوددار، مرڈر، منا بھائی ایم بی بی ایس ،مشن کشمیر، میناکشی، عشق وغیرہ فلموں کے نغمیں بھی لکھے ۔ان کی تمام کتابوں میں روپ روپ، پانچواں درویش، ناراض لمحے، میرے بعد اور دھوپ بہت ہے، وغیرہ شامل ہیں۔

یہ سچ ہے کہ گلزار صاحب اور راحت اندوری کی شاعری کو ہم ابھی تک مشاعروں ،ٹی وی اور یوٹیوب کے ذریعہ سنتے رہے مگر اب ان کی شاعری کو پڑھنے کا وقت آ گیا ہے تا کہ ان کی ادبی زندگی کا محاسبہ کیا جا سکے۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ادبی نشیمن کے ایڈیٹوریل بورڈ نے گلزار دہلوی اور راحت اندوری پر خصوصی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ادبی نشیمن کا یہ شمارہ گلزار دہلوی اور راحت اندوری کی زندگی اور شاعری کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے میں نہ صرف معاون ہوگا بلکہ انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین ذریعہ بھی ثابت ہوگا۔

میں شکر گزار ہوں اپنے تمام مضمون نگاروں کا جنہوں نے اپنی گراں قدر تخلیق ارسال کی۔ صفحات میں اضافہ کے بعد بھی کچھ مضامین شائع ہونے سے رہ گئے جنھیں کسی قریبی شمارے میں شائع کیا جائے گا۔

خوشی کی بات ہے کہ ادبی نشیمن تین برس مکمل کر چوتھے برس میں اس خصوصی شمارے کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا۔ اس موقع پر ادبی نشیمن پریوار اپنے تمام قارئین اور قلم کاروں کا شکر گزار ہے۔

یہ سطر تحریر کرتے وقت بے حد تکلیف ہو رہی ہے کہ محقق ،نقاد اور خطیب پروفیسر فضل امام رضوی صاحب مختصر علالت کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے ۔اس کے علاوہ ڈاکٹر نشتر امروہوی، مظفر حنفی اور ڈاکٹر عشرت فیروز بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ادبی نشیمن کنبہ مرحومین کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم احمد

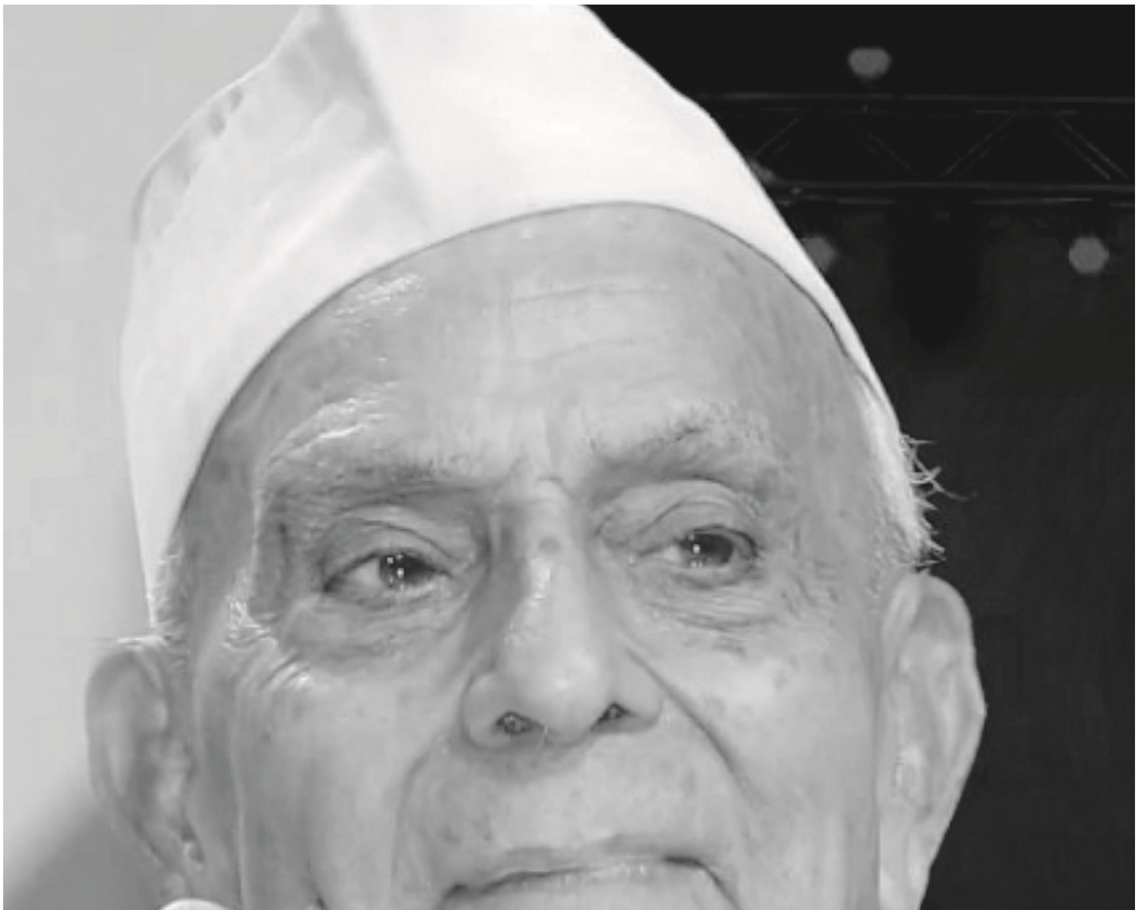
گوشۂ
گلزار دہلوی
(۷؍جولائی ۱۹۲۶ء – ۱۲؍جون ۲۰۲۰ء)

ڈاکٹر عبدالحق امامؔ
محلہ مرزاپور، پوسٹ گیتا پریس، گورکھپور
رابطہ: 9450878330

چند رباعیاں بیاد گلزارؔ دہلوی

آئی ہے خبر کہ چل بسے گلزارؔ آج
افسوس ہوئی بزم سخن ور تاراج
چورانوے سال بعد وہ رحلت ہیں کئے
تاریخ سخن میں جو رہے بن کر تاج

گلزارؔ رہے اردو پہ قربان امامؔ
گلزار تھے سرخیل سخندان امامؔ
وہ نظم و غزل ہو کہ رباعی، قطعہ
ہر صنف سخن میں تھے وہ ذیشان امامؔ

گلزارؔ تھے تاریخ کے اک روشن باب
اردوئے ادب میں تھے مثالِ مہتاب
تا عمر رہے خادم اردو بن کر
اس دور میں ہیں ایسے سخنور کمیاب

گلزارؔ تھے ہر صنف سخن میں ماہر
گلزار تھے اس دور کے اچھے شاعر
ممدوح زمانہ ہے ادب میں ان کا
نقادوں نے بھی دی ہے دلیل غائر

روشن ہے ادب میں تو مقام گلزارؔ
روشن ہے زمانے میں بھی نامِ گلزارؔ
وہ فن سخن میں تھے جہان اردو
ہے خوب بہت کلام گلزارؔ

دبستان دہلی کا آخری سخنور: گلزار دہلوی

ڈاکٹر محمد رضی الرحمٰن

شعبۂ اردو
گورکھپور یونیورسٹی
گورکھپور
رابطہ: 9415380569

اردو شاعری کے مختلف مراکز و دبستان اپنے امتیازی اوصاف کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ان دبستانوں میں دکن، دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور پنجاب خاص مقام کے حامل ہیں۔ الفاظ و تراکیب، محاورے، روزمرے، ضرب الامثال، اور لب و لہجے کے اعتبار سے ان میں کچھ مماثلتوں کے ساتھ بین فرق بھی موجود ہے۔تہذیب وتمدن وثقافت کی خوبی اس پر مستزاد ہے۔

ہر دبستان کی اپنی پہچان اور اپنی اہمیت ہے لیکن دبستانِ دہلی نے ادبی دبستانوں میں جو مقام حاصل کیا ہے وہ کسی اور کے حصّے میں نہیں آیا ہے۔ دہلی سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی بنیادوں پر اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔اس برصغیر میں دلی کو ان معنوں بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس سمندر میں ہر دریا کا پانی موجود ہے۔ مقامی سطح پر بھی قومی لحاظ سے بھی اور بین الاقوامی اعتبار سے بھی۔ ہندوستان کی سطح پر(متحدہ ہندوستان جس کی سرحدیں ایران سے لے کر شری لنکا، بھوٹان اور نیپال تک پھیلی ہوئی تھیں)اس عظیم الشان تہذیبی، ثقافتی، ادبی ولسانی اور معاشرتی مرکز کا سب سے بڑا نمائندہ اور حدی خواں امیر خسرو ہے۔امیر خسرو جو ہندوی اور بالآخر اردو کا سب سے بڑا نقیب ہے۔لسانی، تہذیبی، ثقافتی وتمدنی ابعاد کی پیشکش کا جو سلسلہ خسرو سے شروع ہوا تھا اور جسے میرؔ و مرزاؔ، ذوقؔ و غالب، مومنؔ و ظفرؔ نے پروان چڑھایا تھا اور فکری تنوع و ترفع عطا کیا تھا اور جسے زبان ومحاورے روزمرہ اور طرزِ ادا کی سادگی کی سطح پر بیحد سجل، سرل، رواں اور برجستہ وشگفتہ داغؔ نے بنایا تھا اس کا آخری سخنور، آخری امین اور اس کی آخری کڑی پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی تھے۔

آنند موہن زتشی، گلزار دہلوی جن کی پیدائش ۷/جولائی ۱۹۲۶ء اور وفات ۱۲/جون ۲۰۲۰ء کو ہوئی۔نہ صرف اردو کے بیحد پر گو شاعر تھے بلکہ اردو تہذیب کے ساتھ ہندوستان جنت نشان کی ملواں اور گنگا جمنی تہذیب کے بڑے نمائندہ بھی تھے۔ دہلی کی اردو زبان جو اپنی سادگی، سلاست، شگفتگی اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے جانی پہچانی جاتی ہے اس دہلوی زبان کی شائستگی اور شستگی کی مثالیں دنیا میں دی جاتی رہی ہیں۔ یہ وہی زبان ہے جو بقول غالبؔ:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اس طرح دہلوی زبان کی گھلاوٹ اور ملاحت انسان کو بے مزہ ہونے نہیں دیتی۔ یہی وہ دلی کی زبان ہے جس پر شاہوں کا جلال اور صوفیوں کا جمال سایہ فگن رہا ہے۔ شاہوں نے جسے اپنے جلال سے بارعب بنایا ہے اسے صوفیوں اور خواجاؤں نے وسعت قلب و نگاہ عطا کیا ہے۔ طاہر و پاک بنا کر آب زلال بنا دیا ہے۔ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے دہلی کی اسی روایت کو اپنی شاعری میں سنجونے کی آخری کوشش کی ہے تاکہ آنے والے وقتوں کے لئے یہ سند کے طور پر رہے۔ گلزار دہلوی نے دہلی کی زبان، روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال کو جس خوبصورتی سے اپنی شاعری میں جذب کیا ہے اور تخلیقی سطح پر انھیں استعمال کیا ہے اس کی مثال ان کے بعد کے شعراء کے یہاں نہیں ملتی اور اسی وجہ سے میں نے انھیں دبستانِ دہلی کا آخری شاعر قرار دیا ہے۔ اس بات کا احساس انھیں خود بھی ہے شعر ملاحظہ کیجئے۔

مکدر کچھ فضا گلزار دلی میں سہی لیکن
کہیں اہل زباں ہم سا بھی اردو میں نظر آیا

گلزار دہلوی کی شاعری الفاظ کے گورکھ دھندے کی اسیر نہیں، اور نہ ہی آپ محض زبان کے چٹخارے اور روز مرہ اور محاورے اور بندشوں کے برجستہ استعمال کی خاطر شاعری کرتے ہیں بلکہ ان کی شاعری مضامین کے تنوع اور فکر کی گہرائی سے عبارت ہے۔ وہ بے مغز شاعری کو کارِ عبث خیال کرتے ہیں۔ آپ معیاری فکر کے ساتھ معیاری زبان میں ہم کلام ہوتے ہیں۔ آپ غیر معیاری گفتگو نہیں کرتے اس لئے انھیں موجودہ شعری زبان اور سخنورانِ ادب سے شکایت ہے۔ شعر ملاحظہ کریں۔

اپنی زبان اپنا تمدن بدل گیا
لطفِ کلام اب وہ سخنداں نہیں رہا

تہذیبی و معاشرتی زوال کے اس دور میں زبان بھی زوال پذیر ہے لیکن ایسے ماحول میں گلزار دہلوی نے خود کو اور اپنی زبان کو بچا کے رکھا ہے۔ اس کا احساس انھیں خود بھی ہے۔ شعر ملاحظہ کیجئے۔

ہمیشہ بچ کے چلا ہوں میں عام راہوں سے
ہٹا سکا نہ کوئی میری رہ گذر سے مجھے

گلزار دہلوی کی شاعری جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ ہوائی باتوں پر مبنی نہیں ہے اور نہ ہی آپ بے مغز باتیں کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری میرؔ و مرزاؔ نوشہؔ کی طرح اپنا رشتہ عصر اور عصری مسائل سے شدت کے ساتھ قائم کرتی ہے وہ اپنے تجربات و مشاہدات اور جذبات و افکار کو شعر کے قالب میں بیحد فن کاری سے ڈھالتے ہیں وہ محض حسن کے قصیدہ خواں نہیں اور نہ ہی ذات و کائنات کی محض نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ بلکہ ذات و کائنات کے جملہ مسائل و موضوعات کو مثبت رویے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ کائناتِ نظام اقدار پر قائم ہے اور انسانی برادری بھی مثبت اقدار کے سہارے ہی آگے بڑھتی رہی ہے، لیکن آج کے صارفی کائنات نے سب سے زیادہ چوٹ انسانی اقدار و اخلاق پر کی ہے۔ ہماری تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی و انسانی قدریں ہی ہمیں آدمی سے انسان بناتی ہیں۔ ہمیں اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الارض کے مقام پر فائز کرتی ہیں۔ لیکن موجودہ عہد میں بین الاقوامی اور قومی سطح پر جب اس کا فقدان نظر آتا ہے تو شاعر تڑپ اٹھتا ہے۔ خصوصاً اس دیس میں جہاں ''اتیتھی دیو بھوے'' اور ''وسودھیو کٹم بکم'' اور ''الخلق کلھم عیال اللہ'' کا وظیفہ پڑھا جاتا رہا ہے، اگر اس سرزمین پر ان مذکورہ منتر کو وظیفہ جاں قرار دینے والوں کے درمیان جب یہ شئے عظیم عنقا ہو جائے تو انھیں ملال ہوتا ہے۔

کتنے مومن نظر آتے ہیں صنم خانوں میں
ایک کافر نہیں بستی میں مسلمانوں کی

ہمارے قائدانہ کردار پر آتے حرف سے ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے لہٰذا گلزار دہلوی کبھی تاسف کے ساتھ تو کبھی طنزیہ انداز میں اپنے دل کی باتیں قارئین و سامعین تک مؤثر انداز میں جس میں درد بھی پوشیدہ ہے، پہچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گلزار محض گویا نہیں تھے اور نہ ہی مشاعروں میں جس طرح نوٹنکی ہوتی ہے، اسے انھوں نے کبھی اختیار کیا بلکہ اسے آپ تہذیب سے گری بات سمجھتے تھے۔ مشاعرے کی تہذیب کے خلاف جانتے تھے۔ شاعر اور شاعری کے سنجیدہ اور مہذب کردار کے آپ امین تھے لہٰذا شاعر کا سماج و ملک کے تئیں جو قائدانہ رول ہے اسے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سماج کی بے راہ روی، کجی، کج خلقی پر سلیقے سے گوش مالی کرتے ہیں اور آدمی کو اس کی بشریت سے روشناس کراتے ہیں، اس کے مقام و مرتبے سے متعلق بقولِ اقبالؔ:

آدمیت احترام آدمی
با خبر شو از مقام آدمی

یا جگر کا یہ شعر

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

گلزار دہلوی کا بھی یہ شعر ملاحظہ کریں۔

مقصد حسن ہے کیا چشم بصیرت کے سوا

وجہ تخلیق بشر کیا ہے محبت کے سوا

انسان اور انسانی معاشرہ بشریت اور محبوبی صفات سے انحراف کرتا ہے تو آپ بے چین ہوکر یہ کہتے ہیں۔

ہوا انساں ہی جب انساں کا دشمن
شکایت پھر کسی کی کیا ،گلہ کیا
اٹھی انسانیت یکسر یہاں سے
یکا یک خوئے انساں کو ہوا کیا

خوئے انسانیت کے ختم ہو جانے سے شاعر پریشان ہے، اسے لگتا ہے کہ اگر اسے ہم یا ہماری انسانی برادری نے کھودیا تو پھر یہ دنیا شاید عقوبت خانے میں تبدیل ہوجائے گی ، شاید یہ محض ایک مزار کی شکل میں ہمارے سامنے رہ جائے جس پر صرف عقیدت کے پھول برسائے جائیں۔جب اپنی فطرت اور کردار کی اصل سے ہم یا ہمارا معاشرہ دست بردار ہو جاتا ہے ،تو ایسے وقت میں شاعر خاموش نہیں بیٹھتا بلکہ اس کی کراہ بلند ہوتی ہے۔

ہر شے ہے اس جہاں میں لیکن خدا گواہ
گلزار اس دیار میں انساں نہیں رہا
یہ مشینوں کی چکا چوند یہ دورِ آلات
اس میں ہر چند مقدر ہے ، مروت کے سوا

جسے اقبالؔ نے نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' کے ایک شعر میں یوں رقم کیا تھا۔ ؎

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

فکری مماثلتوں کی یہ خوش کن روایت ہے جسے ہر باضمیر شاعر آگے بڑھاتا ہے۔گلزار دہلوی نے خیال مستعار لے کر اسے آج کے تناظر میں بیحد عمدگی سے پیش کیا ہے۔اس طرح انسانی سماج سے انسان کا گم ہوجانا آج کا سب سے بڑا المیہ ہے۔آج کا انسان جس طرح جبلی سطح پر جی رہا ہے اپنے خوبو سے انکار کا داعی بن چکا ہے وہ لمحۂ فکریہ ہے۔اس کائنات جنت نشان کو اس نے اپنے اسی کردار و افکار سے جہنم زار میں تبدیل کردیا ہے۔شاعر کو اس بات پر شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ ہمارے رہنمایانِ دین و دنیا نے اپنے جبلی اور سفلی جذبات اور شکم کے زیر اثر جو ماحول وفضا پیدا کیا ہے اس سے گلزار دنیا جہنم زار ہوگئی ہے۔آج کے نیرو اخلاقی قدروں کے مزار پر نغمہ سرائی میں مست الست ہیں اور انسانی قدروں کی تمام تر پونجی کو آتش کدۂ ہوس کی نذر کر چکے ہیں۔گلزارؔ دہلوی کے یہ اشعار ملاحظہ کریں جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ کن قدروں کے پاسدار تھے اور پھر عصر حاضر کے منفی مزاج و کردار پر ان کی نگاہ کس قدر گہری تھی۔

نفرتیں کیسی پھیلا رہے ہیں شیخ و برہمن
کیا شمار انکا کریں گے آپ انسانوں کے ساتھ
رہبری تھی کہ رہزنی، توبہ
ہم کو فرمانروا نے لوٹ لیا
چمن میں اس قدر سہمے ہوئے ہیں آشیاں والے
کہ جگنو کی چمک کو سازش برق و شرر جانا

اسی منفی رہبری اور غیر انسانی قائدانہ کردار پر آپ سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے اپنے درد کو اپنی ایک پوری غزل میں یوں بیان کرتے ہیں۔

بن کھلے مرجھا گئیں کلیاں چمن میں کس قدر
زرد روکس درجہ ہائے ماہ پارے ہوگئے
امن کی طاقت کو کچلا سچ کو رسوا کردیا
دشمنوں کے چار دن میں وارے نیارے ہوگئے
دشمن دیں ، دشمن جاں، دشمن امن وسکوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے ہوگئے
حیف گلزارِ جہاں میں چھا گئی غم کی گھٹا
جو شگوفے تھے چمن میں وہ شرارے ہوگئے

''غم کی گھٹا'' کا چھا جانا اور شگوفوں کا شراروں میں بدل جانا فطری عمل نہیں یا خدائی عذاب نہیں بلکہ یہ ہمارا پیدا کردہ ہے۔ان ناگفتہ بہ حالات کے سبب شاعر کی افسردگی ظاہر ہے لہٰذا وہ کہتا ہے کہ:

زخمِ دل کو کوئی مرہم بھی نہ راس آئے گا
ہر گل زخم میں لذت ہے نمک دانوں کی
یہ بھی نہیں کہ گل میں لطافت نہیں رہی
پر جنت نگاہ گلستاں نہیں رہا

اور ایسا کیوں ہے یا کیوں ہو رہا ہے شاعر کی زبان سے سنئے

ہاتھا چھانٹی ہے عجب اور عجب لوٹ کھسوٹ
نیتیں اور ہیں شاید کہ نگہبانوں کی

نگہبانوں کی درویش صفتی جب قزاقی میں بدل جاتی ہے تو پھر اس کا علاج ممکن نہیں ہوتا۔لیکن شاعر قنوطیت کا پیغامبر نہیں ہوتا، خاص طور سے جو واقعی صاحب فکر اور صاحب دل ہوتے ہیں ان کے اندر یہ جذبہ عارضی طور پر پیدا تو ہوتا ہے لیکن یہ غالب نہیں ہوتا اور بالآخر وہ رجائی فکر سے کام لے کر معاشرے کے حوصلے بلند کرتا ہے۔انسانیت کی بقا کے لئے امید کی کرن بن کر نمودار ہوتا ہے۔اشعار ملاحظہ کریں:

جب کبھی جبر نے فرعون کئے ہیں پیدا
طور نے جل کے تجلی سے شہادت دی ہے
دشمن حرف صداقت کو مٹانے کے لئے
موسیٰ وقت نے دنیا پر عنایت کی ہے
صدق نیت سے اگر اسکی چمن بندی ہو
پھر رہے کیوں نہ وطن ملک سلیماں ہو کر
رشکِ گلزار ارم ارض وطن جب ہوگی

اپنے بیگانے بسیں سنبل و ریحاں ہو کر

وطن عزیز کی موجودہ تشویشناک صورتحال کے تئیں آپ نے شاعر کی فکر اور اس کی جانب سے راہِ نجات و فلاح کے مشورے ملاحظہ کئے، ایسے وقت میں جب انسان کی ناقدری ہو رہی ہو، معاشرے میں انتشار پھیلا ہو، امن وسکون عنقا ہو جائے تو زبان کی بھی خیر نہیں ہوتی ۔ انسان و معاشرے کے ساتھ زبان بھی شکار کی جاتی ہے اور اس بات کو اردو والوں سے بہتر کون جان سکتا ہے ۔گلزار دہلوی بھی اردو والے تھے لہٰذا اپنی زبان کی کسمپرسی ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔اس کی توہین وتذلیل پر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا ان کی محبوب زبان پر جب چوٹ پڑتی تھی تو آپ تڑپ اٹھتے تھے۔چنداشعار ملاحظہ کیجئے۔

آج بھی علم وفن وشعر وادب ہے پائمال
باکمالوں کو ملا کچھ نہ اہانت کے سوا
ہر بے ہنر سے گرم ہے بازار سفلگی
اہل ہنر کے واسطے میداں نہیں رہا

اب ذرا موضوع بدلتے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ گلزار صاحب حسن پرست تو نہیں تھے لیکن حسن پسند ضرور تھے لیکن حسن پر بھی زمانے کی طرح زوال آئے گا انھوں نے ایسا سوچا نہیں تھا لیکن حقیقت تو حقیقت ہے۔لہٰذا شعر سنئے۔

ہر بیت جس کے فیض سے بیت الغزل بنے
اب وہ سرورِ چشم غزالاں نہیں رہا

گلزار دہلوی کی شاعری کا ایک بیحد اہم مضمون چشم غزالاں کی بازیافت بھی ہے ۔ حالانکہ چشم غزالاں میں اس سرور کیف کے جس کے آپ متلاشی ہیں اور جو آج انھیں کہیں میسر نہیں یا کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا ، لہٰذا حرف شکایت زباں پر آ ہی جاتی ہے۔لیکن اس کے باوجود بنیادی طور پر گلزار دہلوی عشق ومحبت کے شاعر ہیں۔عشق اور لوازمات عشق کے بیان میں آپ بہت حد تک دہلوی دبستان کی لفظ کی سطح پر بھی اور موضوع ومعنیٰ کی سطح پر بھی جزوی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ میرا ماننا ہے کہ گلزار دہلوی عشق کے روایتی شاعر نہیں ہیں۔عشق کے بیان میں ان کا اپنا رویہ اور انداز ہے کچھ چیزیں آپ نے کلاسیکی شاعری سے ضرور مستعار لی ہیں لیکن بیشتر حسن وعشق کے بیان میں ان کا اپنا منفرد انداز ہے۔

آپ کی شاعری میں مضامین کی سطح پر تنوع پایا جاتا ہے میں تمام تر مضامین کا فی الحال احاطہ تو نہیں کر سکتا لیکن حسن وعشق کے بیان میں ان کا جو انداز ہے محض ان پر اپنی بات کر کے رخصت چاہوں گا ۔حسن وعشق کے بیان میں آپ عموماً روایتی الفاظ وآداب وتراکیب کا بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اس کا بیان روایت سے وابستگی کے باوجود فرسودہ اور پائمال انداز میں نظر نہیں آتا بلکہ اس میں ایک طرح کا رکھ رکھاؤ نیا پن اور لطافت موجود ہے شعر ملاحظہ کیجئے۔

ان کی آنکھوں کی گلابی سے جو ہم مخمور ہیں
اک تعلق ہے قدیمی ہم کو پیمانوں کے ساتھ

گلابی کا استعمال ذرا میرؔ صاحب کے یہاں دیکھیں اور پھر دونوں کے بیان کے فرق کا اندازہ کیجئے میرؔ صاحب کا زندہ اور حلاوت بخش شعر ہے۔

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پر خوں کی اک گلابی سے

گلزار صاحب نے روایتاً اور معناً اپنا رشتہ میرؔ صاحب سے قائم کر رکھا ہے اگرچہ آپ میرؔ صاحب سے آگے نہیں گئے ہیں اور نہ ہی اس کا اظہار آپ نے کہیں کیا ہے ہاں دونوں کی مخموری کی نوعیت الگ ہونے کے باوجود حصولِ حیات ایک ہے۔میرؔ صاحب دل کے راستے سے مخموری زندگی کا ذکر کرتے ہیں تو گلزار دہلوی آنکھوں کے توسط سے نشۂ زندگی سے سرشار نظر آتے ہیں۔ چونکہ عشق وحسن کی عشوہ طرازیوں اور نازوادا کا ایک زمانہ قائل رہا ہے لہٰذا بقول فراقؔ صاحب کے۔

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

گلزار دہلوی بھی ان سے خوب خوب واقف ہیں ۔جلوۂ ہائے بتِ طناز کے نہ صرف آپ قائل ہیں بلکہ ان کی ہوش ربا اداؤں پر نثار بھی ہیں۔ایک شعر ملاحظہ کریں۔

نظر جھکا کے اٹھائی تھی جیسے پہلی بار
پھر ایک بار تو دیکھو اسی نظر سے مجھے

یہ ایک عامیانہ سا شعر معلوم ہوتا ہے لیکن عام مضمون کے ہونے کے باوجود چلتاؤ شعر نہیں ہے بلکہ یہ کم عمری کے تجربے میں سب سے دلآویز تجربہ ہے۔ چند اور عمدہ عشقیہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

ان کے مست خرام نے مارا
ان کی طرفہ ادا نے لوٹ لیا
ہوش و ایمان و دین کیا کہئے
شوخئ نقش پا نے لوٹ لیا
ایک شعلہ نظر نے قتل کیا
ایک رنگیں قبا نے لوٹ لیا
ہائے وہ زلفِ مشک بو، توبہ
ہم کو بادِ صبا نے لوٹ لیا

حسن کا کوئی ، جدا تو نہیں ہوتا انداز
عشق والے انھیں انداز سکھا دیتے ہیں

□□□

گلزار دہلوی: کوئی بتلائے مرے شعر میں میرا کیا ہے

گلزار دہلوی منفرد طرزِ فکر، مخصوص اندازِ بیان اور ایک بڑے کینوس کے شاعر تھے، وہ زندگی کے گہرے تجربات اور مختلف علمی و ادبی مشاہدات کی بھٹی میں تپ کر کندن ہوئے تھے۔ ان کی ذہنی و قلبی کشادگی، وسیع المشربی، فکر بلندی اور انسان پروری کے جذبات نے اردو شاعری کو وسعت عطا کی۔ آفاقیت میں ہمہ گیریت کی قندیلیں روشن ہوئیں۔ انہوں نے جدید خیالات و احساسات کو شاعری میں اولیت دی۔ افکار و اقدار کے نئے رجحانات کو جگہ دی۔ قدیم راہ پر گہری نظر رکھی مگر نئی گزرگاہوں پر چل کر اپنی شاعری کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا نیز اپنے کمالاتِ فن سے اردو شاعری کو مالا مال کیا۔ ان کی روشن خیالی اور جمہوری اقدار کی پاسداری کے بھی ہم سب قائل ہیں۔ انہوں نے مختلف مثنوی اصناف میں طبع آزمائی کی مگر نظموں اور غزلوں میں اصل گلزار دہلوی کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر ہم ان کی غزلیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ وہ قوس قزح کے شاعر ہیں۔ مختلف رنگوں کی آمیزش سے ان کی غزلیں آراستہ نظر آتی ہیں۔ چند مثالیں خاطر نشان ہوں:

دل میں کدورتیں ہیں محبت کی خیر ہو
بدلا ہوا حیات کا عنواں ہے آج کل

خود نگر وہ ہیں اور ہم خوددار
بگڑی بنتی نظر نہیں آتی

ان کے مل جانے سے مل سکتا ہے لحاتی سکون
ٹمٹماتی روشنی جیسے شراروں میں رہے

گلدستۂ تہذیب چمن بن کے رہے ہیں
ہر دور میں ہم ناز وطن بن کے رہے ہیں

ڈاکٹر مشتاق صدف

اسسٹنٹ پروفیسر اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ
رابطہ: 9891471765

مقصد حسن ہے کیا چشم بصیرت کے سوا
وجہ تخلیق بشر کیا ہے محبت کے سوا

سب دعائیں میری نذر جانِ جاناں ہوگئیں
رونمائے جلوہ ہائے بزم امکاں ہوگئیں

موتیا، بیلا، چمنیلی ، جوہی، چمپا اور گلاب
سب فسردہ ہوں بہارِ بوستاں کوئی نہ ہو

گلزار دہلوی نے اردو شاعری کو ایک نئے لب و لہجے سے آشنا کیا۔ اپنے شگفتہ اندازِ بیان سے ہم سب کو متاثر کیا، اپنے عہد کے ادبی ورثہ سے ہمیں مالا مال کیا۔ ان کی اپنی لفظیات کی ایک دنیا دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعرانہ روایت بابا فرید الدین گنج شکر کی قدیم اردو شاعری سے جا کر ملتی ہے۔ میر تقی میر، سودا، داغ، غالب، اقبال اور فیض وغیرہ کی اپنی شاعرانہ عظمت ہے۔

دیکھا جائے تو گلزار دہلوی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو شاعری کے پیرہن کو بدلنے کی بھرپور کوشش کی اور ایک نئے پیکر کو تراشا۔ اظہار کو نیا آہنگ دیا۔ نئے نئے امکانات کو ڈھونڈنے کی جستجو نے گلزار دہلوی کو مقبولیت عطا کی۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے شاعری کے مزاج و مذاق کو بھی بدلا۔ وہ اپنے فکری اور تخیلاتی وجود سے نئی آواز بن کر ابھرے۔ اس آواز میں وہ سب سے مختلف نظر آئے۔ غالب، داغ، مومن وغیرہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی نئی راہ نکالی۔ غالب نے کہا:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

گلزار دہلوی نے کس طرح اپنے لہجہ کو نیا روپ دیا، ملاحظہ کیجئے:

فکر غالبؔ کی، زباں داغؔ کی، مومنؔ کا خیال
کوئی بتلائے مرے شعر میں میرا کیا ہے

گلزار دہلوی نے اردو شاعری کو ایک نئے لب و لہجے سے آشنا کیا۔ اپنے شگفتہ اندازِ بیان سے ہم سب کو متاثر کیا، اپنے عہد کے ادبی ورثہ سے ہمیں مالا مال کیا۔ ان کی اپنی لفظیات کی ایک دنیا دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعرانہ روایت بابا فرید الدین گنج شکر کی قدیم اردو شاعری سے جا کر ملتی ہے۔ میر تقی میر، سودا، داغ، غالب، اقبال اور فیض وغیرہ کی اپنی شاعرانہ عظمت ہے۔

دیکھا جائے تو گلزار دہلوی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو شاعری کے پیرہن کو بدلنے کی بھرپور کوشش کی اور ایک نئے پیکر کو تراشا۔ اظہار کو نیا آہنگ دیا۔ نئے نئے امکانات کو ڈھونڈنے کی جستجو نے گلزار دہلوی کو مقبولیت عطا کی۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے شاعری کے مزاج و مذاق کو بھی بدلا۔

ادبی نشستوں، محفلوں، مشاعروں میں گلزار دہلوی کلام سنانے سے قبل اور درمیان میں جو گفتگو کرتے تھے وہ بھی بلا کی گفتگو ہوتی تھی۔ ان کا اپنا منفرد اندازِ تکلم تھا۔ بولتے تو بولتے چلے جاتے۔ جملوں میں بے ساختگی ہی بے ساختگی ہوتی۔ خوبصورت الفاظ کی بارش کر دیتے تھے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش انہیں سنتا۔ قد چھوٹا مگر باتوں میں ہمالیہ پہاڑ جیسا اندازِ تخاطب ان کی معتبریت میں اضافہ کرتا۔ ان کے معاصرین میں ان کی طرح بے باک کوئی نظر نہیں آتا۔ عہد ساز شخصیتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

جہاں تک اردو شاعری میں اردو لفظیات کی بات ہے، زبان کے استعمال کی بات ہے تو اقبال اور سب اور فیض کے بعد گلزار دہلوی نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان کی لفظیات نے ہمارے قلب و جگر کو گرمایا ہے۔ وفور جذبات کو روانی دی ہے۔ شگفتہ نوائی کو اضطرابی شکل عطا کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ دریا میں انقلاب آ سا، شگفتہ اور دلکش لفظیات موجزن ہیں۔ ان کے حسن بیان اور لفظیات کا عالم ان معدودے چند اشعار میں دیکھئے:

جہاں آباد کا ذرہ ہے تو دلی کا روڑہ ہے
کہیں گلزار پھر تیری زباں دانی نہیں جاتیں

جلتی ہوئی شمعوں سے سحر کے آنسو
بجھتی ہوئی لکڑی کا دھواں ہیں ہم لوگ

گلزار آبروئے زباں اب ہمیں سے ہے
دلی میں اپنے بعد یہ لطف سخن کہاں

اس دورِ کشمکش میں برائے وفاق عام
گلزار دہلوی کا غنیمت وجود ہے

چاہئے حسن سماعت بہر صوتِ سرحدی
نغمۂ فطرت جو بن کر آبشاروں میں رہے

گو شوق نے باندھی ہمیں دستارِ فضیلت
ہم خون تمنا کا کفن بن کے رہے ہیں

گلزار دہلوی کی طبیعت میں بڑی حساسیت تھی۔ وہ اپنے عہد کے درد وکرب، خوشی و غم اور حالات و کیفیات کا بڑا شعور رکھتے تھے۔ وہ وقت کی نئی تبدیلیوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے اندر روح عصر پوری طرح پیوست ہوچکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار عہد نو کی ترجمانی کرتے ہیں۔ تغیر و تبدل ایک فطری عمل ہے جس سے ہر تخلیق کار کا وجود متاثر ہوتا ہے۔ گلزار دہلوی کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے احساس تغیر کی رفتار کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا وہ نئے دم خم کے ساتھ اپنے عہد کے حقائق کو پیش کیا۔ ان کے کلام میں زندگی کے وژن اور وقت کی بہتی دھار کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور جس سے مستقبل متشکل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

زیست میں جد و جہد کی خاطر
خود نشیب و فراز پیدا کر

یہ مشینوں کی چکاچوند یہ دورِ آلات
اس میں ہر چیز مقدر ہے مروت کے سوا

بڑی مدت میں صورت خیر سے بدلی گلستاں کی
خدا رکھے چمن ہوتا یہ تاراجِ خزاں کب تک

میرا گلزار دہلوی سے ایک گہرا رشتہ بھی رہا ہے۔ ان کے ساتھ کئی شعری نشستوں اور مشاعروں میں پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ قطر کے ایک عالمی مشاعرے میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ شعراء کی ایک عظیم اردو کانفرنس میں ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے۔

ساہتیہ اکادمی کی ادبی محفلوں میں بحیثیت پروگرام میں نے انہیں کئی بار دعوت دی۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کا انداز والہانہ ہوتا تھا۔ شفقت سے پیش آتے۔ گفتگو میں نرمی بھی ہوتی اور سختی بھی۔ جملوں میں خوبصورت الفاظ کا استعمال کرکے خوب متاثر کرتے۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ تازہ دم نظر آتے اور دوسروں کو بھی تازہ دم کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی شاعری میں جو سادگی، نرمی، جھنجھلاہٹ، سختی، رومانیت کی گہرسازی، شعری صناعی اور حساسیت ملتی ہے وہ ان کی شخصیت کی دین ہے اور یہ تجربات سے گہری وابستگی کا نتیجہ بھی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

ادبی نشستوں، محفلوں، مشاعروں میں گلزار دہلوی کلام سنانے سے قبل اور درمیان میں جو گفتگو کرتے تھے وہ بھی بلا کی گفتگو ہوتی تھی۔ ان کا اپنا منفرد اندازِ تکلم تھا۔ بولتے تو بولتے چلے جاتے۔ جملوں میں بے ساختگی ہی بے ساختگی ہوتی۔

خوبصورت الفاظ کی بارش کر دیتے تھے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش انہیں سنتا۔ قد چھوٹا مگر باتوں میں ہمالیہ پہاڑ جیسا اندازِ تخاطب ان کی معتبریت میں اضافہ کرتا۔

ان کے معاصرین میں ان کی طرح بے باک کوئی نظر نہیں آتا۔ عہد ساز شخصیتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

جہاں آباد کا ذرہ ہے تو دلی کا روڑہ ہے
کہیں گلزار پھر تیری زباں دانی نہیں جاتیں

بن گیا ظلمت کدہ بھی مرکز نورِ جہاں
انکی آنکھیں جب مرے گھر میں فروزاں ہوگئیں

جس قدر مشرک تھے، منکر تھے خدا نا آشنا
وقت مشکل سب کی روحیں وقف ایماں ہوگئیں

ان کی نگاہ ناز کا یہ التفات ہے
چارہ گروں کا زیست پر احساں نہیں رہا

کیا مرے زخم جگر سے کھل اٹھی ہے چاندنی
کن چراغوں سے زمانے میں اجالا ہوگیا

مندر میں اذاں دی ہے گو روح بلالی سے
احباب مرے دل کی آواز نہیں سمجھے

شاعری عبادت بھی ہے اور ریاضت بھی، حسن بھی ہے اور عشق بھی۔ گلزار دہلوی نے شاعری کی جس دیوی کی پوجا کی اس کے پرکشش حسن اور پیکر کے ہم سب قائل ہیں۔ ان کی ایک شاعرانہ خوبی یہ ہے کہ ان کا شعری اظہار اور شعری بیان پوری جاذبیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔

ان کی شاعری کی نمو پذیرائی قابل داد ہے یعنی نمو کی جاذبیت اس قدر توانا ہے کہ یہ شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس کے اندر زندہ رہنے کی قوت بھری پڑی ہے۔ گلزار دہلوی کی شعری عظمت اور فکری بلندی کا جواب نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں شاعرانہ پرکاری اور شعری بیانی میں تبدیلیوں کو بھی نشانزد کیا جاسکتا ہے۔

ان کا شعری تفاعل اور وجدان کا رچاؤ، ردوسرے شعر کی طرح الجھا ہوا نہیں ہے۔ ان کا لہجہ بہت نکھرا اور روشن نظر آتا ہے۔ گلزار دہلوی کو اپنی شعری روایت کا گہرا علم تھا اس لئے وہ یہ جانتے تھے کہ شاعری میں نیا پن لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان رنگ دوسروں سے مختلف ہو۔

انہوں نے اردو کے بہت سے شعراء کو

پڑھا، ان کے لہجے کو سمجھا، ان سے متاثر ہوئے لیکن ان کی پوری طرح کبھی تقلید نہیں کی بلکہ اپنے رنگ کو انفراد بخشا۔ شاعرانہ تخلیقی انداز کو ایک نئی سمت دی اور ایک نئی شعری فضا کی تخلیق کی۔

گلزار دہلوی کے شعری سفر میں ایک بات بہت نمایاں یہ ہے کہ ان کی شاعری میں ترسیل و ابلاغ کا کوئی مسئلہ نہیں۔ پیچیدہ لفظوں کے اظہار سے انہوں نے ہمیشہ گریز کیا۔ انہوں نے قاری کی ذہنی سطح کو پیش نظر رکھا نیز اپنے انفرادی جوہر سے لہجے کے حسن کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار ہمارے دلوں کو چھو جاتے ہیں اور دل و جان کو اپنے صوتی اثر سے گرفتار بھی کر لیتے ہیں۔ یہ بھی ان کی غزلیہ شاعری کا ایک وصف خاص ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

وہ جس پر میری آوازِ شکست دل کا دھوکہ ہو
یہ کیسی مجھ کو آوازِ شکست جام آتی ہے

ترے ہی دل سے میرا سر، میرے ہی سر سے تیرا در
در کے بغیر سر نہیں سر کے بغیر در نہیں

منزل نما ہیں راہ وفا میں مرے نقوش
سب گامزن ادھر ہیں جدھر گامزن ہوں میں

ساقی ہے، مئے ہے، بربط و چنگ و رباب ہے
اب فکر ہی کسے ہے عذاب و ثواب کی

باکمال شاعر گلزار دہلوی کی فنی بصیرت اور فنی مہارت کی تصویر بالکل عیاں ہے۔ وہ دونوں میں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ فنی مہارت اور فنی بصیرت کی بھٹی میں تپ کر جب تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں تو ان کے یہاں شعریت نکھر کر سامنے آتی ہے۔

میرے نزدیک ان کی شاعرانہ بنیاد یعنی آرٹ آف دی پوئٹ یہ ہے کہ جذبات و احساسات کی سرشاری سے وہ شاعری کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں جس میں بلند آہنگی اور لا یعنی شعور کی آمیزش کم ہے اور تخلیقیت کی نمو زیادہ۔

باکمال شاعر گلزار دہلوی کی فنی بصیرت اور فنی مہارت کی تصویر بالکل عیاں ہے۔ وہ دونوں میں قدرت رکھتے ہیں۔ وہ فنی مہارت اور فنی بصیرت کی بھٹی میں تپ کر جب تخلیقی عمل سے گزرتے ہیں تو ان کے یہاں شعریت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ میرے نزدیک ان کی شاعرانہ بنیاد یعنی آرٹ آف دی پوئٹ یہ ہے کہ جذبات و احساسات کی سرشاری سے وہ شاعری کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں جس میں بلند آہنگی اور لایعنی شعور کی آمیزش کم ہے اور تخلیقیت کی نمو زیادہ۔ یہی ان کی شناخت بھی ہے جس دور میں انہوں نے شاعری کی ابتدا کی، اس وقت بلند لہجے سے گریز کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن گلزار دہلوی نے اپنی نئی ڈگر قائم کی۔ ہر قاری کا شاعر کے تئیں اپنا پرسپشن ہوتا ہے۔

یہی ان کی شناخت بھی ہے جس دور میں انہوں نے شاعری کی ابتدا کی، اس وقت بلند لہجے سے گریز کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن گلزار دہلوی نے اپنی نئی ڈگر قائم کی۔

ہر قاری کا شاعر کے تئیں اپنا پرسپشن ہوتا ہے۔ یہ میرا پرسپشن ہے۔ دوسروں کی رائے مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے اگر ان کے کچھ نظموں کو چھوڑ دیں تو غزلوں کی سطح پر یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ بغیر شور شرابے کے استادانہ آرٹ آف کمیونی کیشن سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا غزلوں میں سادہ لوح لہجہ بھی قابل ذکر ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ گلزار دہلوی اردو کی غزلیہ شاعری میں ایک بڑے قد کے شاعر تھے۔ ان کی شعری جہات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ ان کے بعض شعروں میں تخلیقی مکالماتی جہتیں بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

ان کے تخلیقی تناظر میں اعتبار بشر اور تہذیب عشق کے ساتھ مشترکہ کلچر کی پختہ آواز کو سنا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں نئے خوابوں کی صورت گری بھی خوب ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں متحرک پیکر سے زندگی کی حرارت اور توانائی کا اندازہ ہوتا ہے نیز ایک عمیق لمسی تجربہ کی خوبصورت پیشکش گلزار دہلوی کو ایک معتبر شاعر تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

ان کے یہاں ایک منفرد صوتی اثر، لفظیات کے نئے نئے پیرائے، اپنی تہذیب کی بہترین عکاسی، جذبات و احساسات کی حسین پیکر تراشی اور زندگی کے مختلف رنگوں کو جس کامیابی سے پیش کیا گیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

انہوں نے اپنے عہد کے سماجی، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور نفسیاتی ماحول و منظرنامے کو ایک نیا منظرنامہ بنایا ہے۔ پوری اردو دنیا ان کی شعری کاوشوں کا احترام کرتی ہے۔ گلزار دہلوی دراصل اردو شاعری کے تاج محل تھے جس کی خوبصورتی کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ وہ ہماری یادوں میں اور اپنی تخلیقات میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

❑❑❑

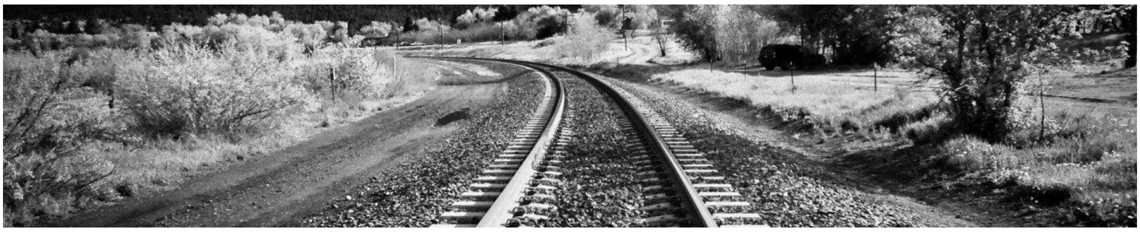

کاغذ آتش زدہ: گلزار دہلوی کا غزلیہ متن

ڈاکٹر صالحہ صدیقی

ریسرچ اسکالر

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی

رابطہ: 9899972265

گلزار صاحب دہلی کے ایک ممتاز کشمیری پنڈت خاندان کے چشم و چراغ تھے، وہ اردو کے سیکولر کردار کی زندہ مثال تھے۔ یہ سیکولر کردار ان کی انسانی دوستی سے عبارت تھا۔ اردو زبان کی ثقافت ان کی شخصیت کی گہری رنگ آمیزی تھی۔ اردو سے ان کی محبت ظاہر ہے۔ دراصل وہ اردو زبان کے تہذیبی مزاج کے پروردہ تھے۔ ان کی محفل اور محبت میں بیٹھنا باعث افتخار سمجھا جاتا تھا۔ ان کی زندگی اور شاعری کی اپنی ایک منفرد فضا ہے، جہاں سکون محبت، انسیت، سادگی، بے قراری، تجسس، اور اضطراب کے ساتھ ثقافتی مزاج ان کی شاعری میں رچا بسا تھا۔ گلزار دہلوی 7 جولائی 1926 کو دہلی کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پنڈت تربھون زتشی زارؔ دہلوی تھا۔ والدہ کا نام رانی زتشی تھا۔ ان کی والدہ بھی اس عہد کی ممتاز شاعرہ تھیں اور بیزار تخلص اختیار کرتی تھیں۔ گلزار دہلوی کی ابتدائی تعلیم رام جیشن اسکول اور بی۔ وی۔ جے سنسکرت اسکول میں ہوئی۔ انھوں نے ہندو کالج سے ایم اے کیا اور قانون کی سند حاصل کی۔ گلزار صاحب انجمن ترقی اردو ہند سے ادیب فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔ وہ ایک مجاہد آزادی اور ایک انقلابی شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے مولانا ابوالکلام آزاد بھی معترف تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 1958ء کے کل ہند اردو کانفرنس کا سیکریٹری گلزار دہلوی کو بنایا تھا۔ اس کے بعد ''کونسل آف سائنٹفک انڈسٹریل ریسرچ سنٹر'' کا ڈائرکٹر بھی مقرر کیا۔ اس عہدے پر آنے کے بعد گلزار صاحب نے ایک اردو رسالہ بعنوان ''سائنس کی دنیا'' نکالا، جس کے بعد انھیں اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ عوام انھیں ''سائنسی شاعر'] بھی کہنے لگی۔ اردو زبان سے گلزار صاحب کی محبت اور ان کی زندگی کو جتنا اچھے طریقے سے ان کے جاننے والے ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے بتا سکتے ہے کوئی دوسرا نہیں بتا سکتا، ان کے جاننے والوں کا حلقہ یوں تو بہت بڑا ہے لیکن ان میں ایک اہم نام فرحت احساس صاحب کی بھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''گلزار صاحب ایک منفرد تہذیبی تجربے کی حیثیت رکھتے تھے، جس میں ایک شخص نے ایک ایسی ثقافت کے عناصر اور اقدار کو اپنی ذات میں جذب کیا، جس میں وہ پیدا نہیں ہوا تھا اور کچھ اس

طرح جذب کیا کہ دوئی کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ یہ تہذیبی جذب وانجذاب کا عمل لسانی ادبی ہی نہیں مذہبی سطح پر بھی بروئے کار آیا۔ ادب اور زبان کی سطح پر جہاں ان کی وابستگی داغ دہلوی کے شاگردوں بیخود دہلوی اور سائل دہلوی سے رہی، وہیں وہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمان جیسے علمائے دین اور مجاہدین آزادی سے بھی وابستہ رہے۔ اس طرح صاف نظر آتا ہے کہ وہ سانچا جس نے ان کی شخصیت کو تشکیل دیا خود ان کا ہی بنایا ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے، جو گلزار صاحب کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

اردو ادب کی تاریخ میں یہ خاندان بلاشبہ ایک عجوبے کی حیثیت رکھتا ہے جہاں خاندان کے تقریبا تمام افراد شاعر تھے۔ گلزار صاحب کے والد پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی ممتاز استاد شاعر تھے۔ والدہ پربھا رانی بیزارؔ دہلوی ممتاز شاعرہ تھیں۔ اور ان کے علاوہ دو بھائی، دادا اور نانا شاعر تھے۔ اس زمانے کے تمام تر اہم شاعر اور ادیب ان کے گھر تقریباً روزانہ ہونے والی ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ گلزار صاحب کی زبان پر اردو کے رس کا جو دریا جاری تھا اس کے سوتے اس خاندان کی تربیت اور ان محفلوں کی چہل پہل میں تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ خاندانی اثرات کے تحت بہت جلد شعر گوئی شروع کردی۔ شاعری میں انہوں نے داغ دہلوی کے مزاج اور محاورے کو اختیار کیا، اور اپنے طرز کی رومانی اور رندانہ غزل کہی، جس میں دہلوی زبان کے ماہرانہ استعمال نے گہری کاٹ پیدا کردی تھی۔ انہوں نے اپنی طویل عمر کے دوران ترقی پسند تحریک اور پھر جدیدیت کے زیر اثر شاعری کے سروکار اور لب و لہجے میں آنے والی تبدیلیوں کو دور سے ایک مشاہد کی نظروں سے دیکھا، مگر روش سے نہیں ہٹے، اور یہ اچھا ہی ہوا کہ پھر وہ گلزار نہ رہ پاتے۔'' (1)

گلزار دہلوی کی شاعری سنسکار میں داغ دہلوی کے نقش پا کی گرد چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اردو زبان وادب سے حد درجہ جنون نے ہی ان کی شخصیت کی تکمیل اور تخلیقی سطح پر فکر و احساس کی نئی گلزار راہیں روشناس کیں۔ وہ درویش صنف شاعر تھے۔ لیکن اپنے وقار اور انا سے کبھی سمجھوتہ بھی نہیں کیا۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اردو سے محبت اہل اردو سے عشق اور ان کی اختصادی تہذیب نے ہی انہیں مقبول کردیا۔ نیز ان کی یہ خوبیاں فن کی شکل اختیار کرگئیں۔ شاعری میں رنگا رنگی ان کی تخلیقی بیتابی کو ظاہر کرتی ہے۔ شعرا سخن کی دنیا ان کے تعلق سے کچھ بھی کہے سچ تو یہ ہے کہ گلزار دہلوی اردو شاعری کے ایک دبستان کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ دبستان کشادہ قلبی، وسیع النظری اور وسیع المشربی سے روشن دکھائی دیتا ہے۔ درحقیقت دبستان گلزار دہلوی میں مشترک ہندوستانی تہذیب وثقافت کا رنگ بہت گہرا ہو جاتا ہے۔ پھر ایک انمول شخصیت نمودار ہوتی ہے، جس کی ہمہ جہت خصوصیت سے انکار ممکن نہیں، میرؔ کی زبان میں:

ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

گلزار دہلوی کی شخصیت اور تخلیق دونوں پر یہ شعر صادق آتا ہے۔ ان کی شخصیت میں بھی بہت سادگی تھی اور شاعری میں بھی کہی سے زیادہ ان کہی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سنتور سے زیادہ خاموشی کا عنصر غالب ہے لیکن خاموشی میں جو فن کاری ہے اس کی نظیر ان کے معاصرین میں کم کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی قوت تخلیق میں حسن و فکر کے جذبات جا بجا مل جاتے ہیں۔ گلزار دہلوی کی حاضر جوابی اور علم وفضل کے کمالات سے ان کی شاعری ہمارے دلوں میں اتر گئی۔ یہ بھی حقیقت کا دوسرا رخ ہے۔ گلزار دہلوی نے یوں تو مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن اگر ہم ان کے غزلیہ رنگ و آہنگ پر غور وفکر کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس میں جلوہ صدرنگ کی کارفرمائی بھی ہے اور حیات وکائنات کی ہم آہنگی کا ادراک بھی۔ شاعری کا خلاق ذہن اور شعری بصیرت کی پوری ادبی دنیا نے داد دی ہے۔ مختلف رنگوں کی آمیزش سے گلزار دہلوی نے اپنی غزلیہ شاعری کو ایک نیا لہجہ دیا۔ نئی آواز دی اور ایک منفرد طرز اظہار بھی، مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

جلتی ہوئی شمعوں سے سحر کے آنسو
بجھتی ہوئی لکڑی کا دھواں ہیں ہم لوگ

فکر غالب کی زباں داغ کی مومن کا خیال
کوئی بتلائے مرے شعر میں میرا کیا ہے

گلزار آبروئے زباں کی اب ہمیں سے ہے
دلّی میں اپنے بعد یہ لطف سخن کہاں

گلزار دہلوی کی غزل روایات سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود ایک منفرد اور یکتا آواز اس اعتبار سے ہے کہ اپنوں نے زندگی سے عشق کا رشتہ اور عشق سے انسانی وجود کا رشتہ اس طرح جوڑ دیا ہے کہ کائنات کی رنگا رنگی میں کوئی آنچ نہیں آتی۔ دوسرے شعرا کی طرح ان

کا بھی عشق کا تصور سمٹا ہوا نہیں ہے تبھی تو مختلف ابعاد پیدا ہوگئے ہیں ۔ان کے یہاں شاعری زندگی کی نفی نہیں بلکہ اثبات کی ترجمانی کرتی ہے ۔حیات و کائنات کی بہتر ہم آہنگی دیکھنے کے لیے گلزار دہلوی کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے ان کی شاعری میں زمینی اور ارضی حسن کی دلفریبیوں کا عمدہ منظر بھی دیکھا جا سکتا ہے نیز ہندستانی تہذیب کی روح اور آرکی ٹائپ خوبصورت عکاسی بھی گلزار کی ایک اہم شعری خصوصیت ہے، یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

چاک دامن جب ہوئے دنیا میں دونوں حسن و عشق
دلفاران محبت دلفگاروں میں رہے

اے کج کلاہ کس کو میسر یہ سوز عشق
جو شان التفات ترے بانکپن میں ہے

مصیبت میں کہاں کوئی کسی کے پاس آتا ہے
تمہاری یاد ہے لیکن کہ صبح و شام آتی ہے

گلزار دہلوی اپنے تجربے کو تخلیقی حسیت سے پوری طرح ہم آمیز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔انھوں نے فراق گورکھپوری کی طرح لزتیت کی فراوانی والے اشعار نہیں کہے ہیں ۔فراق کے یہاں جنسی تجربات کو اجاگر کرنے میں جمالیاتی عناصر کی آمیزش کہیں کھو جاتی ہے یعنی جنس میں جمالیات کا عنصر نہیں ملتا جب کہ گلزار کے یہاں جنس جمالیات کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس نظریے سے فراق کے یہ اشعار دیکھیے:

قبا میں جسم ہے یا شعلہ زیر پردہ ساز
بدن سے لپٹے ہوئے پیرہن کی آنچ نہ پوچھ
حسن کی اف رے کیف سامانی
نغمہ ہیں رنگ و بو ہیں کیا ہیں آپ

کر دے جو فرشتوں کو بھی انسان
کتنا اچھا تیرا بدن ہے

اور اب گلزار دہلوی کے یہ اشعار خاطر نشان ہوں:

سب دعائیں میری نذر جان جاناں ہوگئیں
رہ نمائے جلوۂ ہائے بزم امکاں ہوگئیں

بن گیا ظلمت کدہ بھی مرکز نور جہاں
انکی آنکھیں جب مرے گھر میں فروزاں ہوگئیں

عمر بھر کی مشکلیں پل بھر میں آساں ہوگئیں
ان کے آتے ہی مریض عشق اچھا ہو گیا

گلزار اور فراق کے ان اشعار کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ دونوں کا لہجہ منفرد ہے اسلوب الگ ہے اور موضوع کی پیشکش میں انداز بیانی منفرد ہے ۔فراق کے یہاں جنس ہے لیکن جمالیات کی کمی نظر آتی ہے ۔گلزار دہلوی نے غزل کے کلاسیکی اسالیب سے کسب فیض کرتے ہوئے اپنے انفرادی اسلوب کا رنگ اسی طرح چڑھا دیا کہ ان کی آواز یکتا ہوگئی ہے ۔جس کے سبب آہنگ میں نیا پن آ گیا وہ کلاسیکی شعرا سے بھی خوب متاثر نظر آتے ہیں ۔میر، غالب، مصحفی، جرأت، داغ دہلوی، نواب سائل، بیخود، دتا تریہ کیفی، ساحر، نوح ناروی، سیماب، جوش، جگر، وغیرہ شعرا کی روایت کو روشنی لیتے ہوئے اپنی انفرادیت کو قائم کیا ۔اپنی ادبی و شعری شناخت کو مستحکم کیا ۔یہی وجہ ہے کہ ان کے غزلیہ متن میں دردمندی بھی ہے اور سوز و ساز بھی، شگفتہ بیانی بھی ہے اور بینا کی کے ساتھ حسن کی رنگینیاں بھی، حسی پیکر بھی ہے اور انسانی تجربات کی رنگارنگی بھی ۔ان کے غزلیہ رنگ کو لفظ و معنی کی ایک نئی دنیا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اب شفق یا ابر کا گلزار کیوں ہو انتظار
ان کی آنکھوں سے جو بہنے کا اشارہ ہو گیا

کاٹنے کو دن تو کاٹا ہے پہاڑوں کی طرح
اب شب فرقت نظر آتی ہے طوفانی مجھے

نگاہ ناز کا ان کی جدھر بھی وار ہو جائے
اگر نرگس بھی ہو گلشن میں تو بیمار ہو جائے

مندر میں اذاں دی ہے گو روح بلالی سے
احباب مرے دل کی آواز نہیں سمجھے

گلزار دہلوی غزلوں میں کلاسیکی تلمیحوں، اشاروں اور کنایوں کا بھی استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہے ۔انھوں نے بدلتی زندگی کے بدلتے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ان کی غزل کے اشعار جو بظاہر خوبصورت، دلفریب، پر سکون اور مطالعہ میں لطف اندوز معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے اشعار کے باطن میں معنی کا ایک جہاں آباد نظر آتا ہے، ان کے اشعار بے حد معنی خیز ہوتے ہیں، ان کے اشعار میں لفظ و معنی کی تہہ داری کے ساتھ ۔ساتھ انسانی جذبات و احساسات کی آمیزش سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے ۔ان کے اشعار میں عصری حسیت، عصری تقاضوں اور سماجی حقائق کو بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے ۔گلزار دہلوی کا ایک خاص رنگ یہ بھی ہے کہ انھوں نے روایتی تراکیب کو بحال رکھتے ہوئے بھی جدت طرازی سے کام لیا ہے آپ کے بیشتر اشعار زندگی کی جد

وجہد، سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی مسائل کی علمبردار ہونے کے سبب عوام میں مقبول ہونے کی سند رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کی خاص بات یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں صرف غم، مایوسی، اکیلا پن ہی نہیں ہے بلکہ ایک امید کی کرن بھی دکھائی دیتی ہے۔ غم سے نجات اور خوشی کی طرف رجوع کرنے کی ایک جوت بھی جلی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری کا اہم وصف یہ بھی ہے کہ وہ خود سے مخاطب نظر آتے ہیں جس کے لیے وہ منفرد انداز بیاں بھی اختیار کرتے ہیں جیسے کبھی کوئی بات زیرلب کہہ جاتے ہیں تو کبھی ذرا سی اونچی آواز میں کچھ بتاتے نظر آتے ہیں اور ایسی صورت حال میں اشعار میں تضادات کو وہ یکجا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں کی غزلوں میں ایک معنوی دنیا آباد ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں زمانے کا شعور وادراک رکھتے ہیں۔ بدلتے وقت کے تقاضوں کی جھلک بھی ان کی غزلوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نہ کوئی عشق کا سودا نہ شوق سرفروشی ہے
نہ ذوق جانفشانی ہے نہ اب دادو رسن باقی

بزم تصورات میں محفل شش جہات میں
تیری صفات وذات سے عاری کوئی ڈگر نہیں

یہ گل جو بہاروں نے کھلائے ہیں چمن میں
کیا اس سے ہوا ہوگی خزاں اور زیادہ

گلزار دہلوی نے اپنے احساسات و جذبات کو اپنی غزلوں میں بڑے دلکش پیرائے میں پیش کیا۔ انھوں نے اپنے کلام میں شعری صنعتوں، تشبیہات واستعارات کو انتہائی حسین اور دلکش انداز میں استعمال کر کے دلچسپ بنا دیا۔ ہر شاعر اپنے وقت کا نقیب ہوتا ہے۔ مشاہدات کو شعری سانچوں میں ڈھال کر وہ صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ گلزار دہلوی نے بھی اپنے عہد کے حالات و واقعات اور تغیرات وتجربات کو شعری سانچے میں چھوٹی چھوٹی بحروں میں بھی بڑی خوبصورتی سے ڈھال دیا۔ گلزار دہلوی کی غزل گوئی کا اہم وصف یہ بھی ہے کہ بعض اوقات یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کس سے مخاطب ہیں بنا مخاطب ہوئے اشاروں میں وہ اپنی باتیں کہہ جاتے ہیں، جس سے یہ پتہ چلے بغیر کہ شعر کس کے بارے میں ہے وہ سب اپنے جزبات واحساسات وقلبی واردات کو عیاں کر دیتے ہیں جو شاعری کا سب سے بڑا حسن ہے، ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جب کبھی طوفاں اٹھے تو آدمی کو چاہیے
نوح کی کشتی میں شامل تیز دھاروں میں رہے

کیوں اب طواف کوئے ملامت سے ہے گرانہ
کیا وہ جنون کوچۂ جاناں نہیں رہا

ستم ہائے زمانے کا اثر مجھ پر نہیں ہوتا
اگر گردش بھی چاہے بر سر پیکار ہو جائے

گلزار دہلوی کی شاعری اپنے منفرد لب و لہجے کے سبب اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔ ان کی شاعری سوچتے ہُوئے ذہن کے مقصدِ ابلاغ سے آشنا کراتی ہے، جس سے قدم قدم پر فکر ونظر کی شمعیں فروزاں نظر آتی ہے۔ وہ دروں بینی سے کام لیتے ہُوئے زِندگی کی حقیقتوں اور عصری مسائل کو سمجھنے میں غور وفکر سے کام لیتے تھے جس سے ان کی شاعری فِکر وآگہی کی ہدایتیں نقطۂ نگاہ کو جامعیت عطا کرتی ہیں، نازک بیانی کو بھی سادہ طریقہ سے اپنی شاعری میں بیان کرتے ہے۔ گلزار دہلوی نے بہترین لفظوں کو بہترین ترتیب کے ساتھ اپنی شاعری کو ایک مالے میں اس طرح گوندھا ہے کہ قاری بنا رکے پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ زبان صاف ستھری اور سہل استعمال کرتے ہے۔ خیال، فکر اور پیغام بالکل عیاں ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں حسن و جمال کی دلکش کا بھی انداز خوب ہے، اپنے ان تمام شعری وفنی اوصاف کے سبب انھوں نے شاعری کی دنیا میں اپنا الگ مقام پیدا کیا۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہے تری زلف پریشاں یا مری دیوانگی
جو تما شا کرنے آیا خود تماشا ہو گیا

ہم بجھیں بھی تو بجھیں مثل چراغ سحری
اور جو روشن ہوں تو ہوں شمع شبستاں ہو کر

سو جان سے قربان ہوئے لالہ و نسریں
ہم ایسے گل دشت و دمن بن کے رہے ہیں

گلزار دہلوی اپنے دور کے ادبی مزاج سے بخوبی واقف تھے اس لیے اپنی غزلیہ شاعری میں نئے تلازموں نئے استعاروں، نئی تشبیہوں اور نئی نئی پیکر تراشیوں کے استعمال پر زور دیا۔ انہوں نے اپنے عہد کے سوز وگداز، درد وکرب، ارتعاش، تڑپ، بے چینی کو سمجھا محسوس کیا اور اسے اپنی فکر کا موضوع بنایا۔ وقت کی تھرتھراہٹ کو شعری پیکر عطا کیا۔ جس سے ان کی آواز منفرد ہوگئی۔ انھوں نے روایتی استعاروں اور تشبیہات کو من وعن استعمال سے گریز کیا۔ اپنی شاعری میں اثر آفرینی کو تیز کرنے کے لیے انہوں نے

اپنے مشاہدے، تجربات واحساسات کی بنیاد پر نئی علامتوں اور استعاروں کو تراشا اور ان میں ہندستانی مزاج کو پوری طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔گلزار دہلوی کی شاعری میں ہندوستانی طرز فکر، ہندستانی مزاج، ہندستانی تہذیب وثقافت کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ان کے انھیں اوصاف نے ان کی غزلیہ شاعری کو نادرونایاب بنادیا۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جیسے قدرت کا کرشمہ نو بہاروں میں رہے
مثل شبنم تم لپکتے مرغزاروں میں رہے

لاکھ دنیا نے چھپایا تم کو نظروں سے مری
تم مگر مری غزل کے استعاروں میں رہے

گلزار دہلوی کی غزلوں میں صنعت تضاد کی بھی بڑی خوبصورت مثالیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں، چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

بہار گلستاں کیا ہے عجیب طرفہ تماشا ہے
خزاں دیدہ معاذ اللہ، بہار گلستاں کیوں ہو

جن کو سدا رہی مرے مرنے کی آرزو
جینے کی دے رہے ہیں وہی اب دعا مجھے

حیات و موت میں قائم تھی کشمکش باہم
وہ آ گئے تو کچھ آ ہے میں زندگی آئی

گلزار دہلوی صرف ہندستان اور ہندستان کا دل دلّی کے ہی مشاعروں کے بادشاہ نہیں تھے بلکہ پوری دنیا کے مشاعروں میں ان کا بول بالا تھا،گلزار دہلوی اور مشاعروں کا بڑا گہرا رشتہ تھا،اس سلسلے میں کچھ یادیں تازہ کرتے ہوئے معصوم مرادآبادی لکھتے ہیں:

’’انجمن تعمیر اردو‘‘ کی ان نشستوں میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، شکیل بدایونی ،ساغر نظامی، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر محی الدین قادری زور، قاضی عبدالودود، فیض احمد فیض، مولانا امتیاز علی عرشی، سجاد ظہیر، خواجہ غلام السیدین، مسعود حسین رضوی ادیب، سلام مچھلی شہری، ماہر القادری، پروفیسر آل احمد سرور، سید احتشام حسین، عصمت چغتائی، بیگم صالحہ عابد حسین، علامہ انور صابری، بسمل سعیدی اور عمیق حنفی جیسی شخصیات شریک ہوتی تھیں۔ یہ شعری اور تنقیدی نشستیں پابندی کے ساتھ سترہ اٹھارہ سال تک اس وقت تک چلتی رہیں جب تک ایمرجنسی کے زمانے میں وہاں بلڈوزر نہیں چل گیا۔اس بلڈوزر نے نہ صرف جامع مسجد کی سیڑھیوں کے کلچر کا صفایا کر دیا بلکہ پورے اردو بازار کی ادبی اور تہذیبی فضا کو بھی تہہ و بالا کر دیا۔اس خلفشار سے پہلے انجمن تعمیر اردو کی مخصوص نشستیں اردو بازار میں وہ رنگ جما گئیں، جو ہمیشہ یاد رہے گا۔گلزار دہلوی کی بدولت انجمن کی ان نشستوں میں ادب کی دنیا کی ہر محترم اور معتبر شخصیت نے ان محفلوں کا وقار بڑھایا۔ علامہ زار دہلوی، خار دہلوی، طالب دہلوی، حافظ علی بہادر خاں، گوپی ناتھ امن، انور صابری جیسی برگزیدہ شخصیتیں پابندی کے ساتھ ان نشستوں میں شرکت کرتیں اور ان نوجوان قلم کاروں کا حوصلہ بڑھاتیں جو تنقیدی نشستوں میں اپنی شعری اور نثری تخلیقات پیش کرتے تھے۔ یہ گلزار دہلوی کا دم ہی تھا کہ ان کے علاوہ پاکستان سے جو دانشور اور ادیب ہندوستان آتے تھے، گلزار دہلوی ان کی بھی انجمن کی ان ہی محفلوں میں پذیرائی کرتے تھے۔‘‘(3)

مختصر یہ کہ گلزار دہلوی کی غزلیہ شاعری میں کائنات کا شعور بھی ہے اور حیات کی جلوہ گری بھی ہے۔انسانیت عرفان بھی ہے اور فطرت سے وابستگی کا ان کا اپنا اظہار ہے۔وہ گرد و پیش کے حالات سے باخبر بھی ہیں اور زندگی کی وسعتوں سے واقف بھی ہیں۔ان کے یہاں شور کم ہے خاموشی زیادہ۔

ان کی اپنی ایک منفرد آواز ہے یہ آواز جب ان کی خاموشی سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو احساسات کی نئی کونپلیں پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں اور پھر ان کی خاموش آگہی کا ایک دریا معلوم ہوتی ہے وہ حیات و کائنات کے شورر شرابے اور خاموشیوں کو ایک نئی معنویت عطا کرتے ہیں ۔ان کے یہاں داخلی واردات اور خارجی وقوعات کے امتزاج سے کائنات کے بہت سے بھید منکشف ہوتے ہیں۔زندگی کے اسرار و رموز کی جستجو سے ان کا غزلیہ رنگ عبارت ہے۔یہی وہ خوبیاں ہیں جو گلزار دہلوی کو شہرت دوام بخشتی ہیں۔گلزار دہلوی کی غزلیہ شاعری میں گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ بھائی چارے کی مثال بھی موجود ہے وہ محبت وخلوص کے نغمے تاعمر گنگناتے رہے۔انھوں نے انسانی زندگی کے استعجاد (paradox) کا جس سلیقے سے احساس دلایا یہ انھیں کا حصہ وخاصہ ہے۔

حواشی

(1) آن لائن پلیٹ فارم: قندیل ڈاٹ کام۔
(2) آن لائن پلیٹ فارم: قندیل ڈاٹ کام۔
(3) آن لائن پلیٹ فارم: قندیل ڈاٹ کام۔
(4) گلزار دہلوی کا شعری مجموعہ ’’گلزار غزل‘‘ ،آن لائن ریختہ۔
(5) کلیات گلزار دہلوی، آن لائن ریختہ۔

□□□

گلزار دہلوی : شعلہ کہ شبنم

ڈاکٹر قسیم اختر

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، ڈی ایس کالج

کٹیہار

رابطہ: 9470120116

مے کدہ ویراں سا کیوں ہے خالی ہیں جام وسبو
محفل سے یہ کون اٹھا کہ شمعیں ساری بجھ گئیں

دبستان دہلی کو ہر دور میں ایسے افراد کار میسر آتے رہے ہیں جنھوں نے نہ صرف اسے فروغ دیا بلکہ معاصر دبستانوں میں بھی اس کا نمایاں اور امتیازی مقام قائم رکھا۔ انھوں نے اپنے اس دبستان کو خون جگر بھی دیا اور وقت بھی، وقت بھی وہ جو بہت قیمتی ہوتا ہے، جو دنیا کی تمام اشیا سے قیمتی۔ یہ سلسلہ دور اول کے بعد دور ثانی، عبوری دور، مابعد آزادی و تقسیم اور اس کے بعد بھی۔ چوتھی نسل جدیدیت کے دور میں ابھری اس نے بھی اسلاف کی اس میراث بیش بہا کو سنبھالا اور اگلی نسلوں تک پہنچانے کی ذمے داری قبول کی۔

اس نسل کے ان حاملین میں ایک اہم نام گلزار دہلوی کا بھی ہے۔ جن کا پورا نام 'آنند کمار موہن زتشی، گلزار دہلوی' تھا۔ وہ دہلی کے کشمیریان محلے میں پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی کے گھر 7 جولائی 1926 کو پیدا ہوئے۔ شعر وسخن اور تعلیم و تعلم ان کے خاندان کے اثاثے تھے جو کئی نسلوں سے چلے آرہے تھے اور ہر نسل، ان میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتی رہتی تھی۔ والد جانشین داغ، ماں شاعرہ، بھائی شاعر اور اب خود بھی۔ زار، بے زار، خار اور اب گلزار، اسی خانوادے کے تخلص قرار پائے۔

گلزار دہلوی کی پیدائش کے وقت ہندوستان متعدد دیسی تحریکوں، بیرونی مہمات، نہرو اور گاندھی، علی برادران، محمد علی جناح، علامہ محمد اقبال، حسرت موہانی، ابو الکلام آزاد جیسے ہندوستانی سرخیلوں کی رہ نمائی میں آزادی کی منزل کی جانب گامزن تھا۔ الہ آباد، بمبئی، ڈھاکہ، کان پور اور لاہور مسلم لیگ کے مراکز تھے تو دہلی، کراچی، لکھنؤ اور نینی تال کانگریس کے، بنگال تقسیم ہو کر متحد ہونے والا تھا اور بنگال کے رہ نما قومی جدوجہد آزادی میں اپنے تعاون کے لیے اسکیمیں بنا رہے تھے۔ ملک بھر سے آزادی کے نعرے، بلند ہوتے تھے، انگریزوں سے نفرت اور غیر قوم سے گلوخلاصی کی کوششیں تیز تر ہو جاتی تھیں۔

اخبارات وضمیمے، نکلتے، کانفرنسیں ہوتیں، جلسے منعقد ہوتے، پارٹیاں بنتیں اور تنظیمیں تشکیل پاتیں ،پریس قائم ہوتے اور ضبط ہوتے، پمفلٹ واشتہار شائع ہوتے، کہیں جمعیۃ علما ہند کی کوششیں ہیں تو کہیں سرفروشان ہند ہیں،کہیں روسی انقلاب سے متاثر کمیونسٹ و کامریڈ ہیں تو کہیں خلافت مومنٹ کے جیالے ۔کہیں خدائی خدمت گار تو کہیں کوئٹ انڈیا مومنٹ کے سرگرم کارکنان،کہیں جمعیۃ اہل حدیث ہے تو کہیں کچھ اور... پھران جیالوں اورسرفروشوں کی گرفتاریاں،ان کی سرگرمیوں پر پابندیاں ۔ان کے رستوں پر نگرانیاں اور ان کے آفسوں کے سامنے جاسوسوں ومخبروں کے جمگھٹے ۔غرض یہ دور ایسے ہی ہنگاموں سے لبریز ہوتا آگے بڑھ رہا تھا کہ اب اس کے کارواں میں 'مچھلی کے جائے' کی مانند گلزار دہلوی بھی شامل ہوگئے ۔ان کی ابتدائی تعلیم رامجس اسکول اور بی۔ وی۔ جے سنسکرت اسکول میں ہوئی۔ اعلا تعلیم کے لیے انھیں ہندو کالج (دہلی یونیورسٹی، دہلی) بھیجا گیا جہاں سے ایم اے کیا اورقانون کی سندیں حاصل کی۔ بعدازاں انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، علامہ دتاتریہ کیفی، حضرت بیخود دہلوی اورنواب سائل دہلوی کے بہت قریب رہے اور ان کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے، چنانچہ ان کا اثر ان کی شخصیت اوران کے فکروفن پر گہرا ہے۔

1930 میں وہ اسکول کے زمانے سے ہی قومی تحریک آزادی میں شامل ہوگئے جب کہ وہ محض چار برس کے تھے۔ پھر یہی جدوجہد ان کی زندگی اورشاعری کا ایسا حصہ بن گئی کہ انھیں مجاہد ملّی وقومی کے ساتھ ساتھ 'مجاہد اردو' وشاعری بھی کہا جانے لگا۔جس کی مثال ان کی انجمن 'انجمن تعمیر اردو' [تعمیر شدہ:1947] اور دیگر ایسے کارنامے ہیں جو ہمیشہ ان کی یاد تازہ رکھیں گے۔

گلزار دہلوی بلا شبہ ہماری پرانی اردو تہذیب، بین الانسانی یگانگت ،بین المذہبی یک رنگی اور بین القوم یک جہتی کے نمائندے تھے ۔علاوہ ازیں ان سے وابستہ جو چیز سب

پھران جیالوں اورسرفروشوں کی گرفتاریاں، ان کی سرگرمیوں پر پابندیاں ۔ان کے رستوں پر نگرانیاں اوران کے آفسوں کے سامنے جاسوسوں ومخبروں کے جمگھٹے ۔غرض یہ دور ایسے ہی ہنگاموں سے لبریز ہوتا آگے بڑھ رہا تھا کہ اب اس کے کارواں میں 'مچھلی کے جائے' کی مانند گلزار دہلوی بھی شامل ہوگئے ۔ ان کی ابتدائی تعلیم رامجس اسکول اور بی۔ وی۔ جے سنسکرت اسکول میں ہوئی۔ اعلا تعلیم کے لیے انھیں ہندو کالج (دہلی یونیورسٹی، دہلی) بھیجا گیا جہاں سے ایم اے کیا اور قانون کی سندیں حاصل کی۔ بعدازاں انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، علامہ دتاتریہ کیفی، حضرت بیخود دہلوی اور نواب سائل دہلوی کے بہت قریب رہے۔

سے اہم ہے، وہ ہے ان کی شاعری، جو کہ انھیں شعلہ وشبنم اور کبھی کبھی آتش وآہن بنادیتی ہے۔ان کے لہجے کو تیز تر یا نرم گفتار بناتی ہے۔خود ان کا عکس شامل کرکے ان کے درد وکرب اور فکر ومحن کو جذب کرتی ہے۔اس طرح ان کی غزل کے متعدد عناوین متعین کیے جاسکتے ہیں جن پر مستقل گفتگو کی جاسکتی ہے۔

وہ غزل کے عمدہ اور رومانوی شاعر ہیں بلکہ اردو ادب کی تینوں بڑی تحریکیں ورجحانات، انھوں نے کم وبیش دیکھے ہیں یا ان کا وہ حصہ بھی رہے ہیں۔مزید وہ ان تحریکات ورجحانات کے لیے افراد کار اور خام مواد کی حیثیت سے پیش پیش رہے۔اس طرح ان کی شخصیت اور فکروفن بھی نکھرتا رہا۔

یوں تو وہ بس شاعر اور اچھے شاعر ہی بنے اور اسی میدان میں انھوں نے اختصاص بھی حاصل کیا اور اسی شاعری میں انھوں نے کئی مدارج طے کیے اور کئی سلوک کی راہیں طے کیں۔انھوں نے کثیر مطالعے اور طویل غور کے بعد نظیر اکبرآبادی کا طرز اپنایا۔اس طرح کہ جیسے نظیر نے ہر موسم اور ہر ماحول کے لیے شاعری کی ،نیز چرند پرند،اہم اور غیر اہم اشیا کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا اسی طرح گلزار دہلوی کا طرز بھی تھا۔وہ مسلمانوں کی طرح اردو بولتے اور ان ہی کا سا طرز انھیں اردو کی جاذبیت وصفات نے اختیار کروادیا تھا۔ان کی یہ شعری اور عام زندگی ان کے مندرجہ ذیل شعر سے عبارت تھی:

درسِ اردو زبان دیتا ہوں
اہل ایماں پہ جان دیتا ہوں
میں عجب ہوں امام اردو کا
بت کدے میں اذان دیتا ہوں

گلزار دہلوی، عمر بھر ان ہی روایات کے پاس دار اور انھیں فروغ دیتے رہے۔جب انھیں لگتا کہ یہ رشتے کمزور پڑ رہے ہیں یا ان پر سیاسی و مذہبی جنونی افراد و حاوی ہوکر اس شیرازے کو منتشر کررہے ہیں تو قلم وفکر کے اسباب لے کر محاذ پر آجاتے اوران دشمن افکار سے خوب مقابلہ کرتے اور سرخ رو ہوتے ۔دلّی والے یا دلّی کے روڑے اور دلّی کی روایات

قدیم کے پاسبان ایسا ہی کرتے آئے ہیں، یہ سلسلہ قدیم سے ہی جاری ہے۔ جسے وہ لوگ اپنا فریضہ سمجھتے اور اپنے مذہب و دین پر بھی اسے ترجیح دے کر اس کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ اگر ہم گلزار دہلوی کی شاعری کا مطالعہ کریں گے تو اس میں یہ علائم اور یہ عناصر ہمیں بہ کثرت نظر آئیں گے۔ ''کلیات گلزار دہلوی'' ایسے ہی گلہائے رنگا رنگ سے مہک رہی ہے۔ گلزار اس شاعری میں ہمہ رنگ و انداز میں نظر آتے ہیں ۔ مصلح، انسانیت کے پیامبر، روایات اقدار کے رکھوالے، تہذیب قدیم کے نمائندے۔ دہلی کی آبرو کے امین ،شعلہ،شبنم، نیا آہنگ ،قدیم سوز و ساز، کبھی کوئی روپ تو کوئی۔ مگر ان میں جعل سازی یا فریب دہی کا شائبہ تک نہیں بلکہ ان سے صورتوں اور چہروں وشکلوں کے رشتے اور علاقے انسانیت سے وابستہ ہیں وہ اس فکر سے منسلک ہیں جو دنیا میں امن وامان ، بھائی چارہ، اخوت ،انسانیت، آقا ونوکر کے مابین جذبۂ رحم دلی وغیرہ کے عناوین سے کسی بھی حالت میں پائی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ شعر:

فلاح آدمیت میں صعوبت سہہ کے مرجانا
یہی ہے کام کر جانا یہی ہے نام کر جانا

اسی طرح دیگر فکر مند اور فکر انگیز اشعار ان کی کلیات میں موجود ہیں جو 2010 میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ جب حالات کی ڈور اور ڈگر مزید بگڑی اور حکومتی و انتظامی مظالم سے ہندوستانی اقلیتیں بالخصوص مسلمان، متاثر ہوئے تو گلزار دہلوی نے اس کا دلی صدمہ اور سوگ منایا، اسے ذاتی نقصان کہہ کر اشعار کی زبان میں اپنا احتجاج درج کرایا۔ انھوں نے وحشت و سیاست کے ہاتھوں انسانیت کے ہاتھوں ذبح ہونے اور جہاں معزز انسانوں کی تذلیل ہو کر جینے سے بہتر مرجانے کو قرار دیا ہے۔ اس طرح گویا وہ ان حالات کے ذمے دار افراد کی آنکھیں کھول دینا چاہتے ہیں اور انھیں یہ جتلا دینا چاہتے ہیں کہ تم طاقت اور حکومت کے نشے میں چور ہو کر انسانیت کی پامالی اور بربادی کا سلسلہ روک دو، بصورت دیگر تمھیں قدرت کی پکڑ آ پکڑے گی ۔مگر وہ ان باتوں کو علامت و تجرید کے تیوروں میں کہتے ہیں۔ ان کا یہ شعر دیکھیں تو جو موجودہ حالات کی سنگینیوں کی مناسب عکاسی کرتے ہوئے ان حالات کے پیدا کرنے والوں اور ذمے داروں کے سینوں میں تیر بن کر اتر جاتا ہے:

جہاں انسانیت وحشت کے ہاتھوں ذبح ہوتی ہو
جہاں تذلیل ہے جینا، وہاں بہتر ہے مرجانا

یہ انداز اور یہ تیور، ان کی شاعری کو احتجاج اور بغاوت کی شاعری کے ہم پلہ بنا دیتے ہیں۔ انھیں شبنم نہیں بلکہ شعلہ بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کا عمومی لہجہ نہیں ہے، عموماً تو وہ شبنمی لہجے کے مالک ہیں اور ان کی شاعری آسمان سے اترتی ان پھوہاروں کی مانند ہے جو پیاسی زمین کے جسم میں پیوست ہو کر اس کے تن سے گھاس و ہریالی ننھے منے پودے نکال دیتی ہے۔ گلزار صلح کل اور انسانوں کے مابین واقع خلیج کو پُر کرنے والے مسلک کے اہم داعی اور پیامبر ہیں۔ ان کی نوائے سروش یہ ہے کہ کسی بھی سطح پر کسی بھی سطح کے انسان، خدا کی دیگر مخلوقات اور کائنات پر ظلم نہ ہو کیوں کہ یہ ایسی برائی ہے جس کے باعث نہ صرف یہ کہ ملک وملت کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اور عوام حکومتوں و حاکموں سے برگشتہ ہو جاتے ہیں بلکہ اس کا خمیازہ یکے بعد دیگرے کئی نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

گلزار دہلوی، عمر بھر ان ہی روایات کے پاس دار اور انھیں فروغ دیتے رہے۔ جب انھیں لگتا کہ یہ رشتے کمزور پڑ رہے ہیں یا ان پر سیاسی و مذہبی جنونی افراد حاوی ہو کر اس شیرازے کو منتشر کر رہے ہیں تو قلم و فکر کے اسباب لے کر محاذ پر آجاتے اور ان دشمن افکار سے خوب مقابلہ کرتے اور سرخ رو ہوتے ۔دلّی والے یا دلّی کے روڑے اور دلّی کی روایات قدیم کے پاسبان ایسا ہی کرتے آئے ہیں، یہ سلسلہ قدیم سے ہی جاری ہے۔ جسے وہ لوگ اپنا فریضہ سمجھتے اور اپنے مذہب و دین پر بھی اسے ترجیح دے کر اس کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ اگر ہم گلزار دہلوی کی شاعری کا مطالعہ کریں گے تو اس میں یہ علائم اور یہ عناصر ہمیں بہ کثرت نظر آئیں گے۔ ''کلیات گلزار دہلوی'' ایسے ہی گلہائے رنگا رنگ سے مہک رہی ہے۔

گلزار دہلوی کی ایک حیثیت مجاہد اردو کی بھی ہے جو انھیں ''بابائے اردو'' کا خطاب بھی عطا کرتی ہے۔ انھوں نے 1947 کے پر آشوب، آگ آگ ،دھواں دھواں اور خون خون ماحول میں 'انجمن تعمیر اردو' کی داغ بیل، ڈالی۔ اس وقت پاکستان وجود میں آچکا تھا اور اس کے آئین و دستور سازوں نے اردو کو مملکت خداداد کی قومی زبان کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا، جس کے ہندوستان میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور یہیں کی فضاؤں میں بنی سنوری جوان ہوئی اردو کو دیس نکالا دیا جانے لگا۔ اسے بھی اُن لٹے پٹے مہاجرین کے قافلوں کے ساتھ روانہ کیا جانے لگا جو اثنائے راہ میں ہی کسی فرقہ پرست اور متعصب حیوان نما انسانوں کے گروہ یا جتھے کے ہاتھوں چڑھ جاتے تھے۔ اُن ناگفتہ حالات

میں گلزار دہلوی نے اپنی انجمن کے بینر تلے اس کی بازیافت، بقا، فروغ اور رواج کی جنگ لڑتے رہے؛ اس کی خاطر انھیں غیروں سے زیادہ اپنے ہم مذہب اور ہم قوموں کی طرف سے طعن وتشنیع کی گئی، انھیں برا بھلا کہا گیا مگر وہ اپنے مشن سے جدا نہ ہوئے۔ خیر وشر اور شرار بولہبی سے چراغ مصطفوی کی یہ ستیزہ کاری جاری رہی بالآخر شرار بولہبی اس چراغ مصطفوی نے فتح پالی اور نور خدا کفر کی حرکت پر خندہ زن ہو گیا۔ حق باطل پر غالب آ گیا جو کہ آتا ہے۔ حرم اردو کو صنم خانے سے ایک پاسبان مل گیا اس طرح وہ ہندوستان کے ان حالات میں پنپنے اور فروغ پانے لگی۔ 'انجمن تعمیر اردو' کا اشاعتی اورنشریاتی مرکز 'اردو بازار' کو بنایا گیا جہاں اس وقت کے نامور مذہبی، ملّی، قومی رہ نما آتے رہے اور اردو کے اس چمن کی آب یاری میں اپنا تعاون پیش کرتے رہے۔ معروف صحافی وادیب معصوم مرادآبادی کے مطابق:

"انجمن تعمیر اردو" کی ان نشستوں میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، شکیل بدایونی، ساغر نظامی، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر محی الدین قادری زور، قاضی عبدالودود، فیض احمد فیض، مولانا امتیاز علی عرشی، سجاد ظہیر، خواجہ غلام السیدین، مسعود حسین رضوی ادیب، سلام مچھلی شہری، ماہر القادری، پروفیسر آل احمد سرور، سید احتشام حسین، عصمت چغتائی، بیگم صالحہ عابد حسین، علامہ انور صابری، بسمل سعیدی اور عمیق حنفی جیسی شخصیات شریک ہوتی تھیں۔"

معصوم مرادآبادی مزید لکھتے ہیں:

یہ شعری اور تنقیدی نشستیں پابندی کے ساتھ سترہ اٹھارہ سال تک اس وقت تک چلتی رہیں جب تک ایمرجنسی کے زمانے میں وہاں بلڈوزر نہیں چل گیا۔ اس بلڈوزر نے نہ صرف جامع مسجد کی سیڑھیوں کے کلچر کا صفایا کردیا بلکہ پورے اردو بازار کی ادبی اور تہذیبی فضا کو بھی تہہ وبالا کردیا۔ اس خلفشار سے پہلے انجمن تعمیر اردو کی مخصوص نشستیں اردو بازار میں وہ رنگ جما گئیں، جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ گلزار دہلوی کی بدولت انجمن کی ان نشستوں میں ادب کی دنیا کی ہر محترم اور معتبر شخصیت نے ان محفلوں کا وقار بڑھایا۔ علامہ زار دہلوی، خار دہلوی، طالب دہلوی، حافظ علی بہادر خاں، گوپی ناتھ امن، انور صابری جیسی برگزیدہ شخصیتیں پابندی کے ساتھ ان نشستوں میں شرکت کرتیں اور ان نوجوان قلم کاروں کا حوصلہ بڑھاتیں جو تنقیدی نشستوں میں اپنی شعری اور نثری تخلیقات پیش کرتے تھے۔ یہ گلزار دہلوی کا دم ہی تھا کہ ان کے علاوہ پاکستان سے جو دانشور اور ادیب ہندوستان آتے تھے، گلزار دہلوی ان کی بھی انجمن کی ان ہی محفلوں میں پذیرائی کرتے تھے۔"

> گلزار دہلوی کی ایک حیثیت مجاہد اردو کی بھی ہے جو انھیں 'بابائے اردو' کا خطاب بھی عطا کرتی ہے۔ انھوں نے 1947 کے پرآشوب، آگ آگ، دھواں دھواں اور خون خون ماحول میں 'انجمن تعمیر اردو' کی داغ بیل، ڈالی۔ اس وقت پاکستان وجود میں آچکا تھا اور اس کے آئین و دستور سازوں نے اردو کو مملکت خداداد کی قومی زبان کی حیثیت سے قبول کرلیا تھا، جس کے ہندوستان میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور یہیں کی فضاؤں میں بنی سنوری جوان ہوئی اردو کو دیس نکالا دیا جانے لگا۔ اسے بھی اُن لٹے پٹے مہاجرین کے قافلوں کے ساتھ روانہ کیا جانے لگا جواشنائے راہ میں ہی کسی فرقہ پرست اور متعصب حیوان نما انسانوں کے گروہ یا جتھے کے ہاتھوں چڑھ جاتے تھے۔

اسی طرح معصوم مرادآبادی متعدد تاریخی اور دستاویزی حوالوں سے اس انجمن اور گلزار دہلوی کی ان کاوشوں کو بیان کرتے ہیں اور ان کی اہمیت مابعد کی نسلوں کے کو بتاتے ہیں۔ ان کی ان تحریروں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ گلزار دہلوی 'انجمن تعمیر اردو' کی ہمہ جہت سرگرمیوں اور خدمات کا دائرہ تقریباً 70 برسوں کو محیط ہے۔ یعنی وہ اس انجمن کے تن تنہا فرد رکن اور کارکن بنے رہے۔ اس وقت جب ہندوستان بھر میں سوائے انجمن ترقی اردو [ہند] علی گڑھ کے کوئی کونسل، کوئی اکیڈمی، کوئی ادارہ، کوئی مشن یا کوئی تحریک سرکاری یا نیم سرکاری، کسی طور پر بھی موجود نہیں تھی اس وقت 'انجمن تعمیر اردو' ہی تھی جس نے ہند کے دَیر میں اذان حق پڑھی اور اردو کے مصلیوں کے لیے صفیں آراستہ کیں، امامت کے فرائض گلزار دہلوی نے ادا کیے۔ اس طرح سے یہ عبادت ہندوستان بھر میں مستجاب اور مقبول عنداللہ ہوئی، ہندوستان میں اردو کے فروغ کے سوتے اور بند دھارے دوبارہ کھل پڑے۔ سرکاری، نیم سرکاری، نجی، جامعیاتی، مقابلہ جاتی، انتظامی غرض ہر سطح پر اردو کا بول بالا ہوگیا... اور ان سب مہمات و کمالات کا سہرا گلزار دہلوی کی سیمابی، شبنمی اور شعلگی ذات کے سر ہے۔ اس نیک راہ میں کی جانے والی نیکیوں کا صلہ انھیں ضرور ملے گا۔ نیز وہ اس کے حق دار بھی ہیں۔

□□□

گلزار دہلوی: شخصیت اور خدمات

نیلوفر شعیب

جی ۲، شمس اپارٹمنٹ
بدر باغ، شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ
رابطہ: 9456404388

فکر غالب کی زباں داغ کی مومن کا خیال
کوئی بتلائے مرے شعر میں میرا کیا ہے

پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کی پیدائش کشمیری برہمن خاندان میں 7/جولائی 1926 کو دلّی میں ہوئی۔ ان کے والد پنڈت تربھون ناتھ زتشی 'زار دہلوی' اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی، ریاضی، اسلامیات اور ویدانت کے ماہر تھے۔ درس وتدریس سے وابستہ ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ وہ داغ دہلوی کے سب سے پہلے شاگرد تھے۔ گلزار دہلوی کی والدہ بھی شاعری سے شغف رکھتی تھیں۔ 'بیزار دہلوی' ان کا تخلص تھا اور نواب سائل دہلوی سے ان کو تلمذ حاصل تھا۔ انہیں دلّی کی عورتوں کی ٹکسالی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ وہ ایک خوش کلام شاعرہ تھیں۔ ان کے بڑے بھائی پنڈت رتن موہن ناتھ زتشی خار دہلوی اور ماموں پنڈت گردھاری موہن کول 'عاشق' صاحبِ دیوان شاعر تھے گویہ ان کے گھر میں شعراء کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔

گلزار دہلوی کے آبا واجداد شاہ جہاں کے دور میں شہزادوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ان کے اتالیق، مشیر ومترجم اور ترجمان بن کر کشمیر سے دہلی آئے۔ ان کے خاندان کے کئی بزرگوں کو مغل دربار سے جاگیریں اور خطابات ملے۔ کئی کو 'رائے رایاں' کا خطاب ملا۔ ان کے خاندان کی تقریباً 24 پشتیں دہلی میں رہ چکی ہیں۔

سات برس کی عمر میں گلزار دہلوی نواب سائل اور آٹھ برس کی عمر میں پنڈت دتا تریہ کیفی کے شاگرد ہوئے۔ اسلامی دینیات سائل اور مفتی کفایت اللہ سے حاصل کی۔ مولوی عبدالحق سے بھی نصابی واکتسابی درس حاصل کیا۔ ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کی، ادیب فاضل ومنشی فاضل ہوئے۔ اردو کے عاشق تھے۔ اردو کے تحفظ حق وتبلیغ میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ انہوں نے اردو زبان وادب کی تشکیل اور ترویج میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اس لیے ان کو 'شہید اردو' کہا جاتا ہے۔

اردو سے بے پناہ لگاؤ کی بنا پر 1972 میں اندرا گاندھی کے ایما پر اردو کے مشاورتی بورڈ برائے سائنس کے معتمد اور سہ ماہی مجلہ ’سائنس کی دنیا‘ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ جس پر متعدد سرکاری، ادبی، اور صحافتی ایوارڈز ملے۔ 1989 تک اس سے وابستہ رہ کر انہوں نے ادبی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ اردو میں سائنس کی خدمت کے لیے خوب کام کیے تاکہ سائنسی علوم اور معلومات کو عام اردو طبقے تک پہنچایا جا سکے اور معاشرے میں سائنسی مزاج اور سائنسی رویہ پیدا ہو سکے۔ جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اردو سے ان کی وابستگی کے سبب ان کو ’گلزارِ خسرو‘ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ خطاب انہیں نیشنل خسرو اکادمی آستانہ حضرت نظام الدین سے ملا۔

گلزار دہلوی نے بچپن سے ہی کانگریس کی قومی تحریک میں قومی نظمیں اور تقریروں سے عملی طور پر حصہ لیا۔ نیز شاعری، ڈرامہ، سیاست اور سماجی و فلاحی کاموں میں اور اسکاؤٹنگ میں حصہ لیتے رہے۔ وہ اسٹوڈینٹس کانگریس کے ویکلی اخبار ’اسٹوڈینٹس کال‘ اور ہندو کالج میگزین ’اندر پرستھ‘ کے مدیر بھی رہے۔ آزادی کے بعد کئی رسائل و اخبارات کے اعزازی مدیر، نائب مدیر، معاون اور مشیر رہے۔ ’المعارف‘، حیدر آباد، ’شیشہ و تیشہ‘، بنگلور، ’نورِ سحر‘، میرٹھ، ’جوہر‘، دلی، ’نظامی‘، دہلی، ’ندائے اتحاد‘، دہلی وغیرہ اداروں سے بھی وابستہ رہے۔

گلزار دہلوی کی زندگی کے کئی پہلو ہیں۔ ادبی، سیاسی، اخلاقی و معاشرتی سطح پر ان کی موجودگی کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دیتی ہے۔ اگر چہ سیاست سے ان کا براہِ راست تعلق نہیں رہا لیکن ان کی تحریروں سے اس کے اشعار ملتے ہیں۔ ؎

علاقاں را اشارہ کافی است
سمجھنے والے کے لیے بہت کچھ ہے

انہوں نے اپنی شاعری میں رجعت پسند لیڈروں پر نام لیے بغیر اشاروں اور کنایوں میں کافی کچھ کہہ دیا ہے۔ گلزار دہلوی تحریک ساز شخصیت کے مالک اور متعدد ادبی، ثقافتی اور دینی تنظیموں کے بانی اور منصرم بھی تھے۔

گلزار دہلوی نے بچپن سے ہی کانگریس کی قومی تحریک میں قومی نظمیں اور تقریروں سے عملی طور پر حصہ لیا۔ نیز شاعری، ڈرامہ، سیاست اور سماجی و فلاحی کاموں میں اور اسکاؤٹنگ میں حصہ لیتے رہے۔
وہ اسٹوڈینٹس کانگریس کے ویکلی اخبار ’اسٹوڈینٹس کال‘ اور ہندو کالج میگزین ’اندر پرستھ‘ کے مدیر بھی رہے۔ آزادی کے بعد کئی رسائل و اخبارات کے اعزازی مدیر، نائب مدیر، معاون اور مشیر رہے۔
’المعارف‘، حیدر آباد، ’شیشہ و تیشہ‘، بنگلور، ’نورِ سحر‘، میرٹھ، ’جوہر‘، دلی، ’نظامی‘، دہلی، ’ندائے اتحاد‘، دہلی وغیرہ اداروں سے بھی وابستہ رہے۔

ادیب شہیر نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی نے ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں پر کچھ اس طرح سے روشنی ڈالی ہے:

’’یہ شاعر خوش مقال، عندلیب گلشن دلّی خوش جمال، اردو میں صاحب کمال، آج اردو کے لیے چومکھیا جنگ میں مصروف ہے۔ تخلیقی کام، جماعتی و تبلیغی کام، تربیت و ترویج، اردو 1948 سے اب تک 1969 نا مساعد حالات میں بھی ہر محاذ پر اردو ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔۔۔ اس دور کا گلِ سر سبد وہی دکھائی دیتا ہے۔۔۔ زبان پر عبور، شرافت وضعداری کا مجسمہ، گنگا جمنی تہذیب کا بانکا طرحدار، میرا گلزار، اگلوں کی یادگار، آنے والوں کے لیے الفاظ کا آبشار، یہی تو رہ گیا ہے۔‘‘ [1]

اردو کی بقا اور تبلیغ کے لیے 1947 میں انہوں نے ’انجمن تعمیر اردو‘ کی بنیاد ڈالی اور اس کے جنرل سکریٹری رہے۔ برسوں تک انجمن تعمیر اردو کے نہایت کامیاب جلسے کیے۔ ان جلسوں میں اردو شعر و ادب کے اکابرین کی شرکت ہوتی تھی۔ کئی ہستیاں جو آج آسمان ادب پر ستارہ بن کر روشن ہیں ان کی تربیت یا تعارف انجمن کے ان جلسوں میں ہی ہوا ہے۔

وہ 1952 میں امیر خسرو سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔ 1975 سے غالب میموریل سوسائٹی کے نائب صدر اور 1987 سے عالمی اردو کانفرنس کے نائب صدر اور 1994 سے آل انڈیا اردو رابطہ کمیٹی کے صدر رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے 1974 میں نیشنل رائٹرز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ ان کے اعزازات اور خطابات کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان کو علمائے دین سے ذاتی اور روحانی وابستگی بھی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا آزاد جیسے علماء کی رفاقت بھی انہیں میسر تھی۔ علم دین و دنیا کی خدمت حفاظت ملک میں جملہ مذاہب کا اتحاد اور مشترکہ تہذیب کے تحفظ کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔

بقول ممتاز دانشور سید حامد:

''اس دور میں یہ مشکل چند صورتیں ایسی نظر آئیں گی جو مکمل طور پر مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی تمدن کی جیتی جاگتی تصویر ہوں اور اخلاق حمیدہ کا پیکر ہوں۔ اگر سیکولرزم کی صحیح تصویر دیکھنا ہو اور اردو، ہندی، فارسی، سنسکرت اور عربی کا کلچرل ورثہ، کشمیر، پنجاب، دلی اور یوپی کا سنگم ایک نظر اور ایک شخص میں دیکھنا مقصود ہو تو گلزار دہلوی کو دیکھ لیجیے۔'' ۲؎

گلزار دہلوی عصرِ حاضر کے عظیم صاحب طرز اور اعلیٰ پایہ کے شاعر و لاثانی مقرر بھی تھے۔ ان کے آگے الفاظ دست بستہ کھڑے نظر آتے تھے۔

شاعری کے علاوہ ادبی انشا پردازی، مضمون نویسی، تنقیدی مضامین پر بھی ان کے قلم کی جولانیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کے کلام میں فنکارانہ دیانت و اخلاص اور جرأت، اظہار خیال کے ساتھ سائنسی تحریروں میں ضبط و تحمل اور معروضی اندازِ بیان ہے۔

وہ ایک روشن خیال، وسیع المشرب، سخن سنج، اعلیٰ صفت مشاہد اور تفکر و تجربہ کا حسین امتزاج ہیں۔ انہوں نے اپنی متنوع خدمات سے اردو زبان کا دائرہ وسیع کیا۔ خاص طور پر وضع اصطلاحات اور انگریزی کی تکنیکی اصطلاحوں اور الفاظ کے مناسب اردو میں معنی و مفہوم و ترجمے شائع کر کے اردو کی بے لوث خدمت انجام دی۔

گلزار دہلوی نے غزل، نظم، رباعی، قطعہ، حمد، نعت، قصیدہ، سلام، منقبت اور سیاسی، سماجی، اصلاحی و احتجاجی کلام کا کافی بڑا سرمایہ صفحہ قرطاس پر اتارا ہے۔

1937 سے اب تک کے علمی و ادبی سفر میں انہوں نے کوئی موضوع کوئی سانحہ وواردات یا کوئی تاریخی واقعہ ایسا نظر نہیں آتا جس پر قلم فرسائی نہ کی ہو۔ ممتاز فکشن نگار قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

''گلزار دہلوی کے تعارف میں اردو شاعری کی نصف صدی سے زائد تاریخ مضمر ہے۔۔۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر، جوشیلے خطیب، اردو کے محسن وکیل اور بے مثال Humanist ہیں۔۔۔ اردو کو انہوں نے اپنی نگارشات نظم و نثر سے مالا مال کیا۔۔۔ قومی شاعروں میں گلزار صاحب عہد چکبست و جوش کی یاد دلاتے ہیں۔۔۔ وہ گلزار اردو بھی ہیں اور گلزارِ غزل بھی۔'' ۳؎

گلزار دہلوی عصرِ حاضر کے عظیم صاحب طرز اور اعلیٰ پایہ کے شاعر و لاثانی مقرر بھی تھے۔ ان کے آگے الفاظ دست بستہ کھڑے نظر آتے تھے۔ شاعری کے علاوہ ادبی انشا پردازی، مضمون نویسی، تنقیدی مضامین پر بھی ان کے قلم کی جو لانیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کے کلام میں فنکارانہ دیانت و اخلاص اور جرأت، اظہار خیال کے ساتھ سائنسی تحریروں میں ضبط و تحمل اور معروضی اندازِ بیان ہے۔ وہ ایک روشن خیال، وسیع المشرب، سخن سنج، اعلیٰ صفت مشاہد اور تفکر و تجربہ کا حسین امتزاج ہیں۔ انہوں نے اپنی متنوع خدمات سے اردو زبان کا دائرہ وسیع کیا۔ خاص طور پر وضع اصطلاحات اور انگریزی کی تکنیکی اصطلاحوں اور الفاظ کے مناسب اردو میں معنی و مفہوم و ترجمے شائع کر کے اردو کی بے لوث خدمت انجام دی۔

خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

''وہ اپنی قلم کی جولانیوں سے اردو ادب اور شاعری کو اور عوام کے لیے سائنسی علوم کو اسی طرح اگلی صدی تک جگمگاتے رہیں گے اور اسی خدمت سے وہ 'یادگارِ زمانہ' لوگ کہلانے کے مستحق ہوں گے۔'' ۴؎

گلزار آبروئے زباں اب ہمیں سے ہے
دلّی میں اپنے بعد اب یہ لطفِ سخن کہاں
(گلزار)

مختصر یہ کہ گلزار دہلوی کی ادبی شخصیت اور شاعرانہ صلاحیت، قابلیت، ذاتی کاوش اور مقبولیت نے ان کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ وہ اردو زبان و ادب اور مشترکہ تہذیب و تمدن کے علمبردار تھے۔ آنے والی نسلیں ان کی رباعیوں، نظموں سے بے داغ، بے لاگ اور بے باک تاریخی و سماجی مذہبی رواداری، اتحاد، فساد، تعصب، اتصال و تصادم کی تاریخ کے نشانات تلاش کر سکیں گی۔ اور یہی ان کے زندہ رہنے کا جواز بھی ہے:

مٹتی ہوئی دلّی کا نشاں ہیں ہم لوگ
ڈھونڈو گے کوئی دن میں کہاں ہیں ہم لوگ

حوالے:

۱؎ گلزارِ غزل، گلزار دہلوی، مکتبہ الیوم دہلی، 2000 ص 22

۲؎ گلزارِ غزل، گلزار دہلوی، مکتبہ الیوم دہلی، 2000 ص 28

۳؎ کلیاتِ گلزار دہلوی، پنڈت آنند موہن زتشی، گلزار دہلوی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2000 ص 38

۴؎ گلزارِ غزل، گلزار دہلوی، مکتبہ الیوم دہلی، 2000 ص 18

□□□

گنگا جمنی تہذیب کا حسین سنگم : گلزار دہلوی

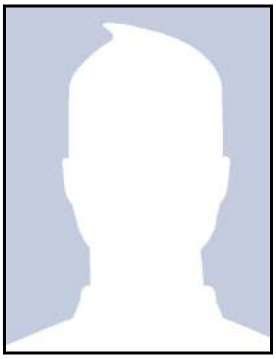

وجاہت فاروقی

۲۰ پنج وٹی کالونی
شاداب کالونی
لکھنؤ

رابطہ: 6386954716

پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی دنیائے اردو ادب میں ایک مشہور و معروف ہستی ہیں جن کا تعلق ایک روشن خیال اور روادار کشمیری برہمن خاندان سے ہے۔ یہ خاندان ہندوستان میں مغلیہ دار سے کئی زبانوں یعنی عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت وغیرہ میں پچھلی بائیس پشتوں سے قائد اور اتالیق رہا ہے۔گلزار دہلوی کے والد پروفیسر پنڈت تربھون ناتھ (1887-1965) نہ صرف اردو فارسی اور عربی کے اسکالر تھے بلکہ داغ دہلوی کے شاگرد اور قادر الکلام شاعر تھے۔ زار دہلوی تخلص فرماتے تھے اور بہت پر گو تھے۔ ایک تو دلی والے پھر داغ کے شاگرد۔ ان کی ٹکسالی زبان کا کیا کہنا، پنڈت زار دہلوی کی اردو ادب کے لئے خدمات ادبی تاریخ داں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ بلا شبہ انہوں نے اردو کی خدمت کو اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے ہونہار بیٹے گلزار کو بھی ایسا خدمت گار اردو بنایا کہ آج اردو اور گلزار دہلوی ایک جان دو قالب سمجھے جاتے ہیں جبھی تو جگر مراد آبادی نے انہیں مجاہد اردو کا خطاب دیا۔

گلزار دہلوی کی والدہ برج رانی زتشی بیزار دہلوی بھی اردو کی شاعرہ تھیں اور انہیں نواب سائل دہلوی مرحوم سے فیض حاصل تھا۔ دنیائے اردو ادب میں والد اور فرزند کے نامور شاعر ہونے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں لیکن باپ کے ساتھ ساتھ ماں کے بھی شاعرہ ہونے کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ گلزار دہلوی نجیب الطرفین شاعر ہیں۔

علامہ زار دہلوی نے اپنے بیٹے کی ابتدائی اصلاح تو خود کی لیکن سونے کو کندن بننے کے لئے اپنے استاد بھائی اور جانشین و داماد داغ نواب سراج الدین احمد خان کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ گلزار دہلوی ایک جگہ لکھتے ہیں:

زار صاحب تھے والد بندہ — اور سائل تھے اپنے اول ہیر
زار و سائل کے ہی تلطف سے — میں ہوں نواب میرزا کا نبیر
میں ہوں گلزار، داغ کا پوتا — اور اردو زباں مری جاگیر

نواب سائل دہلوی کے انتقال کے بعد گلزار دہلوی کا سلسلۂ تلمذ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے ہوتا ہوا آنجہانی پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی دہلوی سے جاملتا ہے جو بجا طور پر اپنے زمانے کے علامۂ عصر کہلاتے تھے۔

گلزارؔ صاحب کو جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نامور اساتذہ اور اہل زبان سخنوروں سے یک گونہ تعلق، قربت اور لگاؤ رہا جن کی صحبتوں میں گلزار دہلوی نے اپنی ذہانت کی بدولت زبان و بیان پر وہ دسترس حاصل کی جس کی پرچھائیاں بھی آج کے بلند قامت اردو شاعروں اور ادیبوں کے یہاں نظر نہیں آتی۔ جوش ملیح آبادی کے یہاں الفاظ اشعار میں بندھنے کے لئے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ گلزارؔ دہلوی کی شاعری میں تو نہیں البتہ تقریر میں کم وبیش یہی صورت حال ہوتی ہے۔ الفاظ ہاتھ باندھے قطار در قطار ان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں اور گلزار دہلوی اپنے لہجے کی گھن گرج کے ساتھ فصاحت و بلاغت کے دریا بہادیتے ہیں۔ گلزار ایک طرف بلند پایہ شاعر، ایک ذی علم ادیب، ایک مخلص صحافی اور شعلہ بیان وگل فشاں مقرر ہیں تو دوسری جانب انجمن اردو اور ادارۂ نظامیہ کے بانی مبانی اور ۱۹۴۶ء سے روح رواں بھی ہیں۔ اسی مناسبت سے کبھی کبھی اپنے آپ کو صوفی آنند موہن زتشی نظامی تحریر فرماتے ہیں اور اس کا ان کو حق ہے۔

گلزارؔ ایک اعتبار سے علامہ اقبال سے مماثلت و نسبت رکھتے ہیں۔ وہ یوں کہ دونوں کشمیری، دونوں کو داغ دہلوی سے نسبت اور دونوں اردو زبان کے شاعر۔ اسی طرح ایک مماثلت سر سید احمد خان سے یوں قائم ہوتی ہے کہ دونوں دہلوی ہیں اور دونوں نے اردو زبان میں سائنس کی ترویج کا بیڑا اٹھایا۔ سر سید نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اسی روش کو آگے بڑھاتے ہوئے گلزار صاحب نے 'سائنس کی دنیا' نامی ہر دل عزیز جریدہ کا اردو میں اجرا کر کے ایک بڑا کامیاب تجربہ کیا جو دور جدید میں اردو پر بڑا احسان ہے۔ عام طور پر ادب اور سائنس کی دنیا الگ الگ مانی جاتی ہے۔ کم از کم مولانا شبلی نے تو شعرالعجم میں یہی خیال ظاہر کیا ہے لیکن گلزارؔ صاحب نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے اور سائنس کی سرحدیں ملا دی ہیں۔ جس طرح ان کی تقریر و تحریر سجیلی اور ٹکسالی ہوتی ہے اسی طرح ان کے سائنسی مضامین میں بھی زور بیان، سائنس کی نپی تلی اصطلاحیں، برمحل الفاظ کا استعمال، ادبی چاشنی اور فصاحت و بلاغت صاف نظر آتی ہے۔

محمد ایوب واقف جو نصف درجن سے زائد بڑی اور اہم کتابوں کے مؤلف اور مصنف ہیں جن کے سیکڑوں مضامین اور مقالے مختلف عنوانات سے پاکستان اور ہندوستان کے متعدد اخبارات و رسائل میں چھپ چکے ہیں، گلزارؔ دہلوی کے متعلق لکھتے ہیں:

'اردو کی بہت ہی پیاری اور فعال شخصیت جناب گلزارؔ دہلوی سے میری ملاقات عروس البلاد میں ہوئی۔ گلزارؔ دہلوی کا نام جب بھی آتا ہے، سر عقیدت و احترام سے جھک جاتا ہے۔ گلزارؔ دہلوی کا نام ویسے تو پنڈت آنند موہن ہے، وہ نسلاً کشمیری برہمن ہیں لیکن میں نے ان کی ذاتی زندگی میں جھانک کر دیکھا تو محسوس کیا کہ وہ مسلمانوں کے طریق اور سبھاؤ میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی یہ سوال کرے کہ اس وقت پورے برصغیر میں کس شخص کی ذات ہندو مسلم تہذیب کا خوبصورت اور خوشنما سنگم کہی جاسکتی ہے تو میں بلا تکلف پنڈت آنند موہن زتشی گلزارؔ دہلوی کا نام لوں گا۔ پریاگ میں ہم گنگا اور جمنا کے جس سنگم کا ذکر اکثر کرتے رہتے ہیں وہ تو محض دو بڑے دریاؤں کا سنگم ہے لیکن گلزارؔ دہلوی کی شکل میں اس وقت خوش قسمتی سے تہذیبوں کا جو سنگم ہمارے پاس موجود ہے اس میں ہندوستان کی صدیوں پرانی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے خدوخال پوشیدہ ہیں۔'

بقول پروفیسر خسرو:

'اس دور میں بمشکل چند صورتیں ہی ایسی نظر آئیں گی جو مکمل طور پر مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی تمدن کی جیتی جاگتی تصویر اور اخلاق حمیدہ کا پیکر ہوں۔ اگر سیکولرزم کی صحیح تصویر دیکھنا ہو تو اردو، ہندی، فارسی اور عربی کا کلچرل ورثہ دہلی، پنجاب، کشمیر اور یوپی کا سنگم ایک شخص میں دیکھنا مقصود ہو تو گلزارؔ دہلوی صاحب کو دیکھ لیجئے۔'

گلزارؔ دہلوی صاحب کو دو چیزیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ پہلی چیز عالم میں انتخاب شہر دہلی میں ان کی سکونت اور دوسری چیز اردو زبان سے ان کا تعلق۔ ان دونوں چیزوں کے تعلق سے اپنے ایک شعر میں انہوں نے بڑی سادگی لیکن پرکاری کے ساتھ کہا ہے:

دلی جسے کہتے ہیں وطن ہے میرا
اردو جسے کہتے ہیں زباں ہے میری

گلزارؔ صاحب اہل زبان اور بلند پایہ شاعر یا ادیب و مقرر کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اردو کے خادم اور مجاہد کے علاوہ سائنسی صحافی کے بانی کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ وجاوید رہیں گے۔

❑❑❑

مشترکہ تہذیب وانسانیت کے علمبردار پنڈت آنند موہن

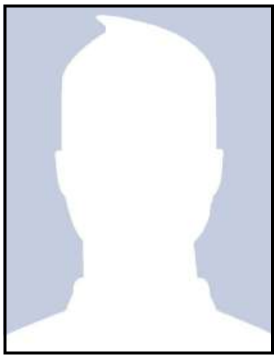

ڈاکٹر راحت حسین

شعبۂ اردو
ایم آر جنتا کالج
مہیش پٹی، اوجیار پور
سمستی پور

گلزار دہلوی 7 جولائی 1926 کو دہلی کے معروف ومشہور شاعر پنڈت تربھون ناتھ کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔آپ اردو، فارسی، عربی، اور انگریزی زبان وادب کے علاوہ ریاضی اور اسلامیات میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔آپ کی والدہ محترمہ بھی شاعرہ تھیں۔گلزار دہلوی کے ماموں گردھاری لعل بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے ظاہری سی بات ہے کہ ایسے گھرانے میں پرورش پانے والے بچے پر شعروسخن کا اثر پڑنا لازمی تھا اور یہی وجہ ہے کہ صرف آٹھ سال کی عمر میں وہ شعر کہنے لگے تھے انہوں نے اس وقت کے نامور شاعر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔اپنے خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے بحیثیت شاعر 1936 یعنی دس سال کی عمر سے ہی معروف ہونے لگے تھے۔اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے انہوں نے دلی یونیورسٹی سے بی اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کئے۔

انہوں نے شروعاتی دور میں درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا پھر 1952 میں مولانا ابوالکلام آزاد کی وزارت میں کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) کا محکمہ قائم ہوا جس کے اشاعتی ڈائریکٹر گلزار صاحب ہوئے۔اسی ادارے سے انہوں نے اردو ادب وصحافت کی تاریخ میں منفرد کارنامہ انجام دیا۔سائنسی علوم کو اردو زبان میں عام کرنے کے لیے اسی محکمہ کی جانب سے ایک رسالہ سائنس کی دنیا جاری ہوا جس کے وہ 12 سال تک مدیر رہے۔اس دوران انہوں نے اردو ادب میں سائنسی علوم پر جو کارہائے نمایاں انجام دیا اس کی بنا پر انہیں سائنسی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔

ملک کی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی بقا کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ان کا مقصد حیات بن گیا تھا تقسیم ہند کے وقت جب اردو کا مستقبل روشن نہیں دکھ رہا تھا تو ایسے وقت میں گلزار دہلوی ہی وہ شخص تھے جو انجمن تعمیر اردو کے ذریعے 1947 کی ٹی پٹی دہلی میں اردو کے چراغ کو روشن کرنے اور اس کی فروغ کرنے میں لگے ہوئے تھے ان کی یہ کوشش نئے ہندوستان میں اردو کی بقا اور اس کی آبرو کے لئے قابل تعریف ہے۔

ان کی انجمن کے تقاریب میں اس دور کے مشہور شعراء اور ادباء شامل ہوتے تھے۔گذشتہ نصف صدی سے ناموافق حالات کے باوجود گلزار صاحب کی علمی، ادبی، تنظیمی اور ثقافتی خدمات جاری وساری رہی۔گذشتہ نصف صدی سے گلزار دہلوی عالمی مشاعروں میں ایک الگ پہچان بنائے ہوئے تھے شاعری میں ان کا خاص انداز واسلوب تھا اپنی غزلوں، نظموں اور رباعیات سے سامعین کے دلوں پر راج کرتے تھے۔جس مشاعرے میں بھی جاتے تھے نہایت کیف ومستی کے ساتھ اور جوشیلے انداز میں سامعین کو محظوظ اور مسرور کرتے رہتے تھے اور شاید وہ اپنی اسی خوبی کی وجہ سے دنیا کے بیشتر ممالک میں مدعو کیے جاتے تھے۔نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کریں۔

زندگی راہ وفا میں جو مٹا دیتے ہیں
نقش الفت کا وہ دنیا میں جما دیتے ہیں
اس طرح جرم میں محبت کی سزا دیتے ہیں
وہ جسے اپنا سمجھتے ہیں مٹا دیتے ہیں

حسرت عمر جاوداں لے کر
جا رہے ہیں سرائے فانی سے

ہائے کیا دورے زندگی گزارا
واقعے ہوگئے کہانی سے

کیا ہوا اگر کوئی ہندو کہ کوئی مسلم ٹھرا
آدمیت کا نہیں پاس جو انساں ہو کر
کیا گلستاں میں نیا حکم زبان بندی ہے
باغباں بھی ہوا صیاد نگہباں ہوکر

گلزار کی شاعری میں عشق ومحبت کا جہاں روحانی رنگ ملتا ہے وہیں حالات حاضرہ پر فکرو افکار اور اشارے بھی ملیں گے اور اتحاد واتفاق کا واضح درس بھی ملتے ہیں۔ انہیں نظریات اور خیالات سے ان کی پوری شاعری مہک رہی ہے۔اس لیے وہ بنیادی طور پر عشق ومحبت اور اتحاد واتفاق کے شاعر تھے۔

گلزار دہلوی ایک سیاسی رہنما بھی تھے وہ ذہنی وفکری طور پر کانگریسی تھے کانگریس کے قدآور لیڈروں سے ان کے گہرے رشتہ تھے، پنڈت جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، لال بہادر شاستری اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت سے گہرے مراسم تھے ایسے تو وہ زندگی بھر کانگریس میں رہے لیکن ملک میں مذہبی منافرت کی وجہ سے ہونے والے ایک سیاہ تاریخ واقعہ کے بعد باضابطہ اعلان کرکے سیاست سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی اختیار کر لی۔گلزار دہلوی ہندومسلم اتحاد کہ ایک ایسے علمبردار تھے جو اقلیتوں کے ہونے والی ناانصافی، ظلم اور تفریق کو محسوس کرتے ہیں اور پھر اسے شعر کے قالب میں ڈھال کر اپنے کرب کو کم کرتے ہیں۔ چند شعر اسی مناسبت کے پیش خدمت ہیں۔

فلاح آدمیت میں صعوبت سہہ کے مرجانا
یہی ہے کام کر جانا یہی ہے نام کر جانا

جہاں انسانیت وحشت کیا تو زباں ہوتی ہو
وہاں تذلیل ہے جتنا وہاں بہتر ہے مرجانا

ہماری سادہ لوحی تھی خدابخشی کی خوش فہمی
کہ ہرانسان کی صورت کو مافوق البشر جانا

چمن میں اس قدر سہمے ہوئے ہیں آشیاں والے
کہ جگنو کی چمک کو سازشی برق وشرر جانا

ہمیں خوار وطن گلزار پیارے ہیں گل تر سے
کہ ہر ذرے کو خاک ہند کی شمس وقمر جانا۔

گلزار صاحب دنیا کے کے تقریبا 50 ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کی جانب سے 36 ممالک کے شعراء کی کانفرنس کے موقع پر گلزار صاحب نے ہندوستان کی نمائندگی کی، وہ پہلے اردو شاعر و ادیب ہیں جنہوں نے یواین او میں اردو زبان میں تقریر کی اور تمغہ واعزاز حاصل کیا۔ہندو پاک اور دنیا بھر کے ممالک کے انجمنوں، اکیڈمیوں اور اداروں کی جانب سے انہیں مختلف ایوارڈز و اعزازات ملے ہیں۔

گلزار صاحب شاعر، خطیب اور سیاسی لیڈر کے علاوہ وہ ایک بہترین مصنف بھی تھے جن کی چند تصانیف درج ذیل ہے۔

گلزار غزل (شعری مجموعہ)، گلزار دہلوی کی مطبوعات، للکار (نظموں کا مجموعہ)، لنکن کے دیس میں (امریکہ کا سفر)، بیرسٹر آصف علی (شخصیت اور سوانح) کہکشاں (منظومات کا مجموعہ)، کلیات گلزار دہلوی۔

افسوس ہمارے درمیان سے ایک ایسی شخصیت اٹھ گئی جو ہندوستان جنت نشان میں سیکولرزم اور ہندومسلم مشترکہ اتحاد کا روشن چراغ تھی۔ جو ہندستان کی شعری وادبی، علمی و تہذیبی اور مذہبی وروحانی تاریخ کا خزانہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی اب ایسی کوئی منفرد شخصیت دور دور تک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ بہ قول شاد عظیم آبادی:

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
جو یاد نہ آئے بھول کے پھر اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

❑❑❑

گوشۂ
راحت اندوری
(یکم جنوری ۱۹۵۰ء — ۱۱/اگست ۲۰۲۰ء)

مرغوب اثر فاطمی
روڈ نمبر ۷، محلہ علی گنج، گیا (بہار)
رابطہ: 9431448749

قالب راحت سے مل گئی

اس کو تمیزِ زمزمہ قدرت سے مل گئی
پھر تو کلید بیت ریاضت سے مل گئی

باتیں عوام سے جو ہوئیں اس کی دو بدو
روحِ نظیر قالب راحت سے مل گئی

کہتا رہا بہ بانگ دُہل ظلم کو وہ ظلم
ایسا نہیں کہ فکر سیاست سے مل گئی

لہجے کا طنز چبھتا رہا تاج و تخت کو
اہل وطن کی داد جسارت سے مل گئی

خاک وطن سے پیار کا اظہار برملا
ایسا کیا کہ مدح صداقت سے مل گئی

نعتیں کہیں کچھ ایسی عقیدت میں ڈوب کے
الفت کی لو چراغِ شفاعت سے مل گئی

بھولے گی کب بھلائے وہ آوازِ منفرد
اکثر جو انبساط و ظرافت سے مل گئی

پہنچائے اس نے ادنیٰ مضامین بام پر
جب ندرتِ بیان بھی جرأت سے مل گئی

دورِ مسابقت میں کٹھن کوس بھی ملے
شہرت کہاں کسی کی عنایت سے مل گئی

اردو کی محفلیں ہوں کہ ہندی کا منچ ہو
واں سرخروئی سب کی حمایت سے مل گئی

کیا موت کو پڑی تھی کہ دروازہ پیٹتی
تکلیف دل کی حیلۂ آفت۱ سے مل گئی

فردوس میں شہید کا درجہ نہ کیوں ملے
جب ہستئ مجاز حقیقت سے مل گئی

تھی مردِ ذی وقار کی مدحت کی جستجو
طرزِ سخن کو دھار سعادت سے مل گئی

تجھ کو اثرؔ ردیف، عجیب اتفاق ہے
ممدوح کے سفر۲ کی رعایت سے مل گئی

❑❑❑

۱۔ کورونا کی وبا
۲۔ رحلت

راحت اندوری کی شاعری میں سیاسی شعور و آگہی

سلیم انصاری

ایچ آئی جی ۳،
آنند نگر، ادھرتل
جبل پور
رابطہ: 7070135643

گذشتہ کئی دہائیوں کے سفر میں اردو شاعری نے کئی پڑاؤ اور نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ روایتی شاعری سے لے کر ترقی پسندی اور پھر جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک اردو شاعری نے کئی جہتوں میں نہ صرف سفر کیا ہے بلکہ ہیت، موضوعات اور اسلوب کی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کو بھی اپنے دامن میں جگہ دے کر ادب کے خزانے کو مالا مال کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ اردو شاعری میں غزل نے موجودہ عہد میں اپنے روایتی حصار سے باہر نکل کر عصری مسائل و مصائب اور معاشرتی اور تہذیبی تقاضوں کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ اب اردو کا نئے سے نیا شاعر غمِ جہاں کو اپنی شاعری میں سمونے کی بھرپور کوشش کرتا ہے، وہ چاہے مشاعروں کے پلیٹ فارم پر ہو یا پھر رسائل و جرائد کے حوالے سے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ مشاعروں میں جس طرح کی شاعری مقبول ہوتی ہے وہ سطحی اور سنجیدہ فکر و شعور سے عاری ہوتی ہے۔ اس طرح بعض ناقدین نے شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک وہ شاعری جو مشاعروں کے سامعین کی ذہنی اور فکری سطح کو پیشِ نظر رکھ کر کی جاتی ہے، دوسری قسم وہ ہے جس میں گہرے فکر و شعور اور عصری بصیرت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی مشاعروں میں پیش کی جانے والی شاعری اور رسائل و جرائد کے ذریعہ ہم تک پہنچنے والی شاعری کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچ دی گئی ہے۔

یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ ادب کے سنجیدہ قارئین کو موجودہ مشاعروں کی شاعری نے مایوس ہی کیا ہے کہ اس میں بہت سامنے کے سطحی نیز ہنگامی موضوعات کو غزل یا نظم کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض نئے شعراء تو مشاعروں میں اپنی جگہ بنانے کے لئے ہنگامی اور سطحی جذباتیت کو شعوری طور پر اپنی شاعری میں برتنے کا کام کرتے ہیں۔ اس سے قطع نظر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مشاعروں میں شامل ہونے والے کچھ ایسے شعراء بھی ہیں جنھوں نے مشاعروں کی قیمت پر اپنی شاعری کے معیار سے مفاہمت نہیں کی۔

ایسے شعراء کی فہرست قابلِ قدر ہے جس میں بشیر بدر، ندا فاضلی ،شہریار،مخمور سعیدی،مظفر حنفی،وسیم بریلوی، اقبال اشہر اور راحت اندوری ،شکیل جمالی ،شکیل اعظمی ، ملک زادہ جاوید، شہپر رسول وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

راحت اندوری ان چند خوش قسمت شاعروں میں ہیں جنہیں اردو مشاعروں میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کا نام مشاعروں کے حوالے سے ہی دنیا بھر کے متعدد ملکوں تک پہنچا،ایک وقت وہ بھی تھا کہ ان کی شمولیت کے بغیر کسی مشاعرے کا تصور بھی ممکن نہ تھا کیونکہ ان کا نام مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف راحت اندوری سے محبت رکھنے والوں کا ایک بہت بڑا حلقہ موجود تھا وہیں ان کے مخالفین کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔اور یہ وہ لوگ تھے جو راحت اندوری کی شاعری کو مشاعروں تک محدود رکھنے اور سنجیدہ ادب سے باہر کرنے کی ترکیب میں لگے رہتے تھے۔کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ مشاعروں کی سستی اور وقتی شہرت نے اردو ادب سے ایک بڑا ذہین اور معیاری شاعر(راحت اندوری) ہم سے چھین لیا ۔خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کے موافقین اور مخالفین آپ کی شاعری کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں بلکہ اہم بات یہ ہے کہ آپ نے جو شاعری تخلیق کی ہے وہ ادب کے معیار و میزان پر کہاں ٹہرتی ہے اور فنی اور فکری لحاظ سے بڑی شاعری کہلانے لائق ہے بھی یا نہیں۔

میرا خیال ہے کہ راحت اندوری کی شاعری کو مشاعروں کی مقبولیت یا شہرت کے پیمانوں پر نہ دیکھا جائے بلکہ فن کے مروجہ میزان و معیار پر ہی پرکھا جائے۔یہ بات سچ ہے کہ راحت اندوری نے مشاعروں میں کچھ ایسے اشعار بھی سنائے جنہیں سنجیدہ شاعری کے زمرے میں نہیں رکھا سکتا،ظاہر ہے یہ الزام کسی بھی شاعر پر عائد کیا جا سکتا ہے کیونکہ شاعری ہمیشہ یکساں معیار و مزاج کی نہیں کی جا سکتی ، راحت اندوری کے یہاں بھی ایسے اشعار موجود ہیں جن پر غیر معیاری ہونے کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے مگر ایسے اشعار کی تعداد بھی ان کے یہاں قابلِ لحاظ ہیں جو ذہنوں ذہنوں اور ملکوں ملکوں سفر کرتے ہوئے ہمارے اجتماعی شعور اور سائیکی کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کے نام اور شناخت کو تا دیر زندہ اور روشن رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ایسے ہی کچھ اشعار پیش کرتا ہوں۔

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

لہو لہان پڑا تھا زمیں پہ اک سورج
پرندے اپنے پروں سے ہوائیں کرنے لگے

میرے حجرے میں نہیں اور کہیں پر رکھ دو
آسماں لائے ہو، لے آؤ، زمیں پر رکھ دو

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

اس کی یاد آئی ہے سانسوں ذرا آہستہ چلو
دھڑکنوں سے بھی عبادت میں خلل پڑتا ہے

آسمانوں کی طرف پھینک دیا ہے میں
چند مٹی کے چراغوں کو ستارہ کر کے

ان اشعار میں دیر تک زندہ رہنے کی صلاحیت ہے کہ نہیں اس کا فیصلہ تو ادب کے سنجیدہ قارئین اور بالغ نظر ناقدین ہی کریں گے ، مجھے تو بس یہ کہنا ہے کہ راحت اندوری کی شاعری کا ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو شاعری کی اعلیٰ فنی قدروں کی میزان پر کھرا اترتا ہے۔اب ان اشعار کو ہی لے لیں ان میں لہولہان سورج کو پرندوں کا اپنے پروں سے ہوائیں کرنا،مٹی کے چراغوں کو ستارہ کر کے آسمانوں کی طرف پھینکنا ،دھڑکنوں سے عبادت میں خلل پڑنا،ایک کاسہ بدست قلندر کا تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آنا،تاج کا عجائب گھر میں رکھا ہونا،آسمانوں کا زمیں پہ رکھ دینا،دراصل ایسی تراکیبِ لفظی اور معنی خیز استعارے ہیں جو عصری شعور و آگہی کے تخلیقی اظہار کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور شاعر کی فکر کو نئے زاویوں اور نئی دشاؤں میں منعکس کرنے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔

راحت اندوری کی شاعری کو مشاعرے میں سن کر سامعین کے ذہن و دل پر مرتب ہونے والے اثرات کو پیمانہ بنا کر ان کی شاعری کا محاسبہ کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں بلکہ طریقہ کار یہ ہونا چاہئے کہ ان کی شاعری کا بالاستعیاب تفصیلی مطالعہ کیا جائے اس کے بعد ان کی شاعری کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جائے ۔ راحت اندوری کی شاعری کے مطالعے سے گزرتے ہوئے جو تاثر سب سے پہلے ابھرتا ہے وہ یہ کہ ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہے،ان کا ڈکشن مخصوص ہے اور ان کے یہاں تخلیقی اظہار کا سلیقہ موجود ہے۔ان کے یہاں محسوسات،مشاہدات اور

جذبات کی آمیزش سے نئے شعری پیکر تراشنے کی ہنرمندی موجود ہے۔وہ کبھی مبلغ اور مصلح نظر آتے ہیں،کبھی ایک قلندر کی صورت دنیا سے بے نیاز دکھائی دیتے ہیں تو کبھی زندگی سے براہِ راست مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں مگر ان کی شاعری پر جو رنگ سب سے زیادہ غالب ہے وہ ایک عدم مطمئن شخص کی آواز ہے ،ایک ایسا شخص جو نہ صرف موجودہ معاشرے کی بے یقینی ،بے زمینی اور انتشار کو اپنی آواز کا پیرہن بناتا ہے بلکہ وہ موجودہ سیاسی نظام اور عدم مساوات کے خلاف بھی چیخنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔اور یہی وہ جذبہ ہے جو راحت اندوری کی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کو نئی زبان اور نیا رنگ عطا کرتا ہے۔اگر چہ ہر شاعر کسی نہ کسی سطح پر اپنی شاعری میں مزاحمت کا اظہار کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات اور مشاہدات سے عدم اتفاق کے نتیجے میں ہی تخلیقی عمل سے گزرتا ہے،مگر مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ راحت اندوری کی شاعری میں جہاں بہت سارے فکری اور ذہنی رویے ملتے ہیں وہیں ان کی شاعری کا کلیدی اور مرکزی شناخت نامہ ان کے شدید مزاحمتی خیالات اور عدم اطمینان کے امتزاج سے مرتب ہوتا ہے۔اس اعتبار سے دیکھیں تو وہ اپنے مخصوص مزاج اور رنگ کے منفرد شاعر ہیں جو ہمیشہ عدم مساوات اور سماجی تفریق کے خلاف نبرد آزما رہتا ہے۔مثال کے طور پر کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

عجیب رنگ تھا محفل کا، خوب محفل تھی
سفید پوش اٹھے کائیں کائیں کرنے لگے

سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

اپنی پہچان مٹانے کو کہا جاتا ہے
بستیاں چھوڑ کے جانے کو کہا جاتا ہے
پتیاں روز گرا جاتی ہے زہریلی ہوا
اور ہمیں پیڑ لگانے کو کہا جاتا ہے

دو گز زمیں سہی یہ مری ملکیت سہی
اے موت تو نے مجھ کو زمیندار کر دیا

محبتوں کا سبق دے رہے ہیں دنیا کو
جو عید اپنے سگے بھائی سے نہیں ملتے

طوالت کے خوف سے مزید اشعار کو نقل کرنے سے گریز کرتے ہوئے ، مجھے یہ کہنا ہے کہ ان اشعار میں سیاسی اور سماجی نظام سے نہ صرف احتجاج کا رویہ موجود ہے بلکہ مظلوم انسانیت پر ظلم اور استحصال کے خلاف بھی ایک آواز موجود ہے جو ایوانِ حکومت تک پہنچتی ہے وہیں وطن سے شدید محبت کا جذبہ بھی نظر آتا ہے ،اس کے علاوہ معاشرے میں تہذیبی بکھراؤ کے نتیجے میں فرد کی منافقت کو بھی راحت اندوری کی شاعری میں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ راحت اندوری کی شاعری میں مجموعی طور پر کوئی بہت بڑا فکری نظام نہیں اور نہ ہی کوئی فلسفہ ہے اور نہ ہی کوئی پیچیدہ ڈکشن اور علامت نگاری ،مگر ان کا اسلوب براہِ راست اور متاثر کن ہے یہی نہیں ان کے زورِ بیان بھی منفرد ہے جو قارئین اور ناقدین دونوں کو متاثر کرتا ہے۔

لہٰذا میرے نزدیک یہ بات بڑی معیوب ہے کہ راحت اندوری کو محض مشاعرے کے شاعر کے طور پر یاد کیا جائے۔اس حقیقت کے باوجود کہ ان کی شہرت کا سبب مشاعرے ہی ہیں پھر بھی ان کی ادبی حیثیت کو کسی بھی طور پر کم کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔راحت اندوری کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی کہیں نہ کہیں مشاعرے میں ہونے والی دھاندلیوں سے واقف تھے اور مایوس بھی۔

راحت اندوری اب ہم میں نہیں کہ وہ کرونا جیسی موذی وبا کا شکار ہوکر دنیا سے رخصت ہوگئے ،اور ایسے بدنصیب لمحوں میں قدرت نے انہیں ہم سے چھین لیا جب انہیں آخری سفر میں کاندھا دینے کی سعادت بھی بس چند لوگوں کو نصیب ہوئی ،راحت اندوری کی آخری غزل سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ عنقریب ہی اپنے آخری سفر پہ روانہ ہوں گے جس کا ثبوت یہ اشعار ہیں۔

خموشی اوڑھ کے سوئی ہیں مسجدیں ساری
کسی کی موت کا اعلان بھی نہیں ہوتا

وبا نے کاش ہمیں بھی بلا لیا ہوتا
تو ہم پہ موت کا احسان بھی نہیں ہوتا

مجھے لگتا ہے کہ راحت اندوری جس ادبی شناخت کے مستحق تھے وہ انہیں نہیں ملی لہٰذا مجھے امید ہے کہ ہمارے ناقدینِ شعروادب ایک بار پھر راحت اندوری کی شاعری کا بغور اور بغیر کسی تحفظ کے مطالعہ کریں گے اور ان کی صحیح ادبی قدر و قیمت متعین کر کے ادبی فریضہ انجام دیں گے۔

❑❑❑

گونج خاموش ہوئی

ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری

۲۹۴، مولوی فیض اللہ مارگ،

حریرپورہ،

برہان پور، (ایم پی)

رابطہ: 9753210869

مسائل ومشکلات اور کشمکش سے گھری دنیا کو جو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، تعصب، ظلم وجبر، سفا کی اور غیر انسانی رویے پر جس نے ہمیشہ احتجاج ومزاحمت کی صدا بلند کی، انسانیت سوز مظالم اور محرومیوں پر تڑپ اٹھا اور جو ایک حسین دنیا اور ماحول کے خواب دیکھا کرتا تھا، بالآخر وہ فن کار بھی اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھے بغیر اپنا بوریا سمیٹ کرونا کے دنوں میں ملک عدم کو روانہ ہو گیا، اس شخص کا نام ہے راحت اندوری۔ جی ہاں جس نے سیاست دانوں کو آئینہ دکھایا، ملک کے بدلتے ہوئے حالات کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا، جس نے عام بوریا نشین فقیر سے لے کر ایوانِ اقتدار کے بڑے سے بڑے مسند نشین کی لغزشوں اور کوتاہیوں کی سرزنش کی، وہ جیالا تخلیق کار بھی رخصت ہوا۔

راحت اندوری اگر چہ عہد حاضر کے مشاعروں کے بے تاج شاعر رہے ہیں، عوامی مقبولیت بھی جگ ظاہر ہے، اردو دنیا کے علاوہ دیگر زبانوں میں، فلم اور میڈیا وغیرہ سبھی جگہ انہیں شہرت ومقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری ادبی اعتبار سے قابلِ اعتنا نہیں۔ یقیناً عہد حاضر کا نقاد راحت اندوری کی شاعری سے چشم پوشی کر کے آگے کا سفر طے نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ملک کی نصف صدی کی تاریخ اور ماحول کی تفہیم کے لیے بار بار راحت اندوری کے اشعار حوالے کا کام کریں گے۔

کہا جاتا ہے کہ فن کار اپنے ماحول سے بے بہرہ ہو کر کوئی فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا، یہ بات صد فی صد راحت اندوری پر بھی صادق آتی ہے۔ ہمارے یہاں بعض شعرا ایسے ہیں جو مشاعروں اور عوامی مقبولیت میں تو اونچے مقام پر فائز ہیں لیکن ادبی وتنقیدی نقطۂ نگاہ سے ان کا کلام اس معیار کا نہیں جیسی ان کی شہرت ومقبولیت ہے، لہٰذا یہاں نقاد کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر راحت اندوری کی شاعری کے ضمن میں ہم ایسا نہیں کہہ سکتے کیوں کہ ادبی لحاظ سے ان کے یہاں نہ صرف بعض اشعار بلکہ متعدد غزلیں اس پائے کی ہیں کہ ان کا شمار ادب اردو کی معیاری شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔ یوں ادبی اور عوامی دونوں لحاظ سے موصوف کا مقام ومرتبہ قابلِ لحاظ ہے۔

راحت اندوری کی ابتدائی زندگی تعلیم و تعلّم اور جہد مسلسل سے عبارت ہے، وہ اگرچہ اندور جیسے بڑے شہر میں پلے بڑھے، مگر ان کا رابطہ ہمیشہ عوامی اور زمینی سطح کے افراد سے مربوط رہا۔ درس و تدریس کے مقدس فریضہ سے وہ کئی برس تک وابستہ رہے، اعلیٰ تعلیم حاصل کی، لہٰذا پڑھے لکھے لوگوں اور اشرافیہ طبقہ کے ساتھ ساتھ معاشرے اور محلے کے معمولی اور ادنیٰ و کم رتبہ افراد سے بھی ان کی وابستگی تھی۔ زندگی کے ہر پڑاؤ اور معاشرے کے ہر گوشے کا انھوں نے گہرا مشاہدہ کیا۔ اسی لیے جس طرح ان کے یہاں اعلیٰ مسند نشین شخصیات جلوہ افروز ہیں اسی طرح ادنیٰ حیثیت کے افراد، غریب، مزدور، بوریا نشین، فقیر و قلندر مزاج اشخاص بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ راحت اندوری نے اپنے تئیں حتی المقدور کوشش کی ہے کہ معاشرے کے تمام تر افراد پر محیط اپنے مشاہدے کو اپنی شاعری میں بے کم و کاست پیش کیا جائے۔ الغرض زندگی کے تلخ تجربات، ذہنی کیفیات اور اپنی نفسیات کو راحت اندوری نے ابتدا سے ہی اپنے اشعار کا جامع پہنایا ہے۔ انسان اور معاشرہ کی رہنمائی کرنے کی بھی کوشش کی، اور ایک پختہ کار ذہنیت کا ثبوت اپنے اشعار کے ذریعے فراہم کیا ؂

ٹوٹ کر بکھری ہوئی تلوار کے ٹکڑے سمیٹ
اور اپنے ہار جانے کا سبب معلوم کر

متعدد مقام پر وہ گفتگو کا انداز روا رکھتے ہیں اور بول چال اور عوامی لہجہ کا لطف اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں، ان کی یہ انفرادیت ابتدا تا حال قائم رہی۔ اکثر و بیشتر مقامات پر وہ ایسے لفظیات استعمال کرتے ہیں جو مقبولِ عام ڈکشن سے دور محسوس ہوتی ہیں، وہ کیوں کہ رائج عوامی زبان سے اخذ کردہ ہیں اس لیے رفتہ رفتہ قبولِ عام کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جنہیں پہلے پہل سننے پر ایک گونہ غیر مانوسیت کا احساس ہوتا ہے، لیکن اپنی شہرت و مقبولیت اور اپنی عوامی ہر دلعزیزی کے طفیل یہ اشعار بار بار گوش گزار ہونے سے مانوس ہو جاتے ہیں اور قاری خود کو محظوظ ہونے سے نہیں روک پاتا۔ اس طرح راحت اندوری اپنی شاعری میں کامیابی کا زینہ طے کرتے جاتے ہیں، اور اپنا منفرد اسلوب اور لفظیات بھی وضع کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

راحت اندوری کی شاعری کے مختلف ابعاد ہیں، انہوں نے اپنے تمام تر جذبات و خیالات اپنے اشعار میں پوری ایمانداری سے پیش کیا، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے بہانگِ دہل اپنی بات کہی اور اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ وقت کا دانشور اور ادب کا ناقد کیا فیصلہ صادر کرے گا، راحت اندوری اپنی دھن کے پکے تھے، کہتے رہے ؂

تو جو چاہے تو ترا جھوٹ بھی بک سکتا ہے
شرط اتنی ہے کہ سونے کی ترازو رکھ لے

غزل پر تنگیِ داماں کی شکایت عبث ہی تھی، عہد حاضر کا شاعر حیات و کائنات کے تمام تر مسائل و مشاہدات کے برتنے کے لیے آزاد ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو حسن و عشق کے ماسوا مضامین ہی غزل کی زینت بن رہے ہیں۔ راحت اندوری کے لیے بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اپنے افکار و خیالات کے جو موتی نچھاور کیے ہیں ان میں احساسِ برتری، لہجۂ انکاری، شاہانہ تفاخر، بے نیازی، عوامی بیداری، استفسار، انسان دوستی بطورِ خاص لائقِ ذکر ہیں، علاوہ ازیں اس دنیا کی تزئین کاری اور انسانوں کی رہنمائی کو بھی وہ سرفہرست رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں احتجاج و مزاحمت کے رویے اپنی جگہ، سیاسی اقتدار، معاشی و سماجی شخصیات کے رسوخ، باحیثیت افراد کے رویے اور اس کے منفی اثرات پر بھی وہ قدغن لگانا چاہتے ہیں۔ ان معاملات کی نشاندہی کر کے ایک نیا ماحول اور نئی دنیا کا خواب بنتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے اس حسین خواب کی تعبیر دیکھے بغیر اس سفاک منظر کو اپنی آنکھوں میں لیے رخصت ہو گئے مگر اپنا حقِ احتجاج اور اپنے خوابوں میں وقوع پذیر مناظر کا نقشہ ضرور پیش کر گئے ہیں۔ مثلاً ؂

سکوتِ زیست کو آمادۂ بغاوت کر
لہو اچھال کہ کچھ زندگی میں جان پڑے
ہمارے شہر کی بینائیوں پہ روتے ہیں
تمام شہر کے منظر لہو لہان پڑے

اک سلگتا چیختا ماحول ہے اور کچھ نہیں
بات کرتے ہو یگانہ کس امین آباد کی

موت کا زہر ہے فضاؤں میں
اب کہاں جاکے سانس لی جائے

کہہ دو اس عہد کے بزرگوں سے
زندگی کی دعا نہ دی جائے

شہروں کے سلگتے چیختے ماحول پر راحت اندوری کی آنکھیں اشک بار رہیں، اس مسموم فضا پر انہوں نے ہمیشہ ضرب لگائی اور امن و امان کے خواہاں رہے، وہ ہمیشہ انسان دوستی، بھائی

چارہ، خداترسی اورعظمتِ انسانی کے گن گاتے رہے، اور جہاں کہیں انہیں ظلم و بربریت، وطن عزیز کی فضا کو مکدر کرنے والے عناصر کی موجود گی اور ناروا فیصلوں کی بھنک لگی یا انصاف کا خون ہوتا ہوا دکھائی دیا، انہوں نے اپنے قلم کا حق ادا کیا، اپنے مافی الضمیر سے اٹھنے والی آواز پر لبیک کہتے ہوئے علی الاعلان اور برسرِمحفل اپنی بات کہی۔ وہ اس بات سے بھی اکثر و بیشتر نالاں رہے کہ صدیوں کی تاریخ و روایات کو بھلاکر بعض لوگ جور و جبر کا سہارا لے کر حق داروں کو محرومیوں کے دلدل میں ڈھکیلنا چاہتے ہیں، جو سراسر غلط ہے۔

میں نے اے سورج تجھے پوجا نہیں سمجھا تو ہے
میرے حصہ میں بھی تھوڑی دھوپ آنا چاہیے

ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گزرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے

ہمدردِ انسانی کا تقاضہ ہے کہ اپنی سعی و کوشش کے ذریعے اس حسین دنیا کو مزید خوبصورت بنائیں، اس میں مزید خوش رنگ پھولوں کی آبیاری کی جائے اور ماحول و پس منظر کو اور زیادہ دلکش و دلنشیں بنایا جائے، مگر بعض رکاوٹیں ایسی دل خراش اور حوصلہ شکن ہوتی ہیں کہ انسان کی ساری ہمت اور جدوجہد پر قدغن لگادیتی ہے۔ اس دنیا کے لیے بعض نا مناسب کردار ہمیشہ اپنی کریہہ سرگرمیوں میں ملوث رہتے ہیں۔

اس آدمی کو بس ایک دُھن سوار رہتی ہے
بہت حسین ہے دنیا اسے خراب کروں

راحت اندوری کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کا طنزیہ انداز ہے بعض جگہ مزاح کی پھلجڑیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے طنز کا نشتر بڑا پر اثر ہوتا ہے۔ طنز میں مختلف انداز دیکھنے کو ملتے ہیں، کہیں سنجیدگی در آتی ہے، کہیں طنز اور تلخی باہم مشترک دکھائی دیتے ہیں، اور کہیں طنز پر مزاح حاوی ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ غالباً اپنی بات سنجیدگی سے کرتے کرتے جہاں انہیں لگتا ہے کہ اس طرح بات نہیں بن رہی ہے تو وہ طنز کا سہارا لے کر اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔ یوں قاری کے ذہن و دل پر نقش ثبت کردیتے ہیں۔

راحت اندوری نے اپنی شاعری کے لیے جو لفظیات اور تراکیب استعمال کیں وہ عام بول چال کی ہیں، مشکل الفاظ و اصطلاحوں سے انہوں نے حتی الوسع اجتناب برتا، آسان ترین زبان میں اپنی بات کہی۔ اس طرح اگرچہ گنجینۂ معنی کا طلسم کی سی کیفیت شعر میں پیدا نہ ہوئی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے بالکل سامنے کی باتیں، موجودہ مظاہر اور پیشِ نظر موضوعات کو رواں انداز میں پیش کر کے اپنے حصے کی داد وصول کی۔ کسی بھی قسم کے مضامین ہوں اور کیسے ہی موضوعات ہوں راحت اندوری نے اسے اپنے مخصوص و منفرد طرز میں ادا کیا جو گویا انہیں کا تخلیق کردہ تھا۔ جسے سن کر سامعین نہ صرف محظوظ ہوئے بلکہ اس میں انہیں اپنائیت کے احساس کے ساتھ ساتھ ذاتی جذبات کی ترجمانی کا احساس ہوا۔ لوگوں کو یہ لگا کہ اُن کے اپنے ذہن و دل کی بات ان کی اپنی زبان اور لہجہ میں کہی گئی، اس طرح سامعین نے راحت اندوری کے اشعار کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ راحت اندوری نے اشعار میں مکالمہ اور گفتگو کا سا انداز اختیار کر کے اپنے سامعین کو بارہا متحیر کیا، طنز و تلخ کے اشتراک سے جب وہ سوالات قائم کرتے ہیں وہ ایک الگ ہی لطف دیتے ہیں۔

راحت اندوری نے اپنی شاعری کے لیے جو لفظیات اور تراکیب استعمال کیں وہ عام بول چال کی ہیں، مشکل الفاظ و اصطلاحوں سے انہوں نے حتی الوسع اجتناب برتا، آسان ترین زبان میں اپنی بات کہی۔

اس طرح اگرچہ گنجینۂ معنی کا طلسم کی سی کیفیت شعر میں پیدا نہ ہوئی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے بالکل سامنے کی باتیں، موجودہ مظاہر اور پیشِ نظر موضوعات کو رواں انداز میں پیش کر کے اپنے حصے کی داد وصول کی۔ کسی بھی قسم کے مضامین ہوں اور کیسے ہی موضوعات ہوں راحت اندوری نے اسے اپنے مخصوص و منفرد طرز میں ادا کیا جو گویا انہیں کا تخلیق کردہ تھا۔ جسے سن کر سامعین نہ صرف محظوظ ہوئے بلکہ اس میں انہیں اپنائیت کے احساس کے ساتھ ساتھ ذاتی جذبات کی ترجمانی کا احساس ہوا۔ لوگوں کو یہ لگا کہ اُن کے اپنے ذہن و دل کی بات ان کی اپنی زبان اور لہجہ میں کہی گئی، اس طرح سامعین نے راحت اندوری کے اشعار کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

راحت اندوری نے اشعار میں مکالمہ اور گفتگو کا سا انداز اختیار کر کے اپنے سامعین کو بارہا متحیر کیا، طنز و تلخ کے اشتراک سے جب وہ سوالات قائم کرتے ہیں وہ ایک الگ ہی لطف دیتے ہیں ان کا یہ مخصوص انداز ہے جسے ہم انہیں سے منسوب پاتے ہیں، شعر اور مصرعوں میں کبھی کبھی ایک لفظ سے بھی چٹکی لے کر سامعین کی حس کو پھڑکنے پر مجبور کر دیتے ہیں:

پھر جگایا تو نے سوئے شیر کو
پھر وہی لہجہ درازی آؤں کیا

راحت اندوری کی شاعری کا کینوس

بہت وسیع ہے رنگِ شفق کی طرح انہوں نے اپنے اشعار میں متنوع موضوعات کو چھوا ہے اس طرح متعدد خوبصورت رنگ ابھر آئے ہیں۔ذاتی تجربات ان کے یہاں آ کر جگ بیتی بن گئے ہیں، حالاں کہ سرسری مطالعہ سے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سیاسی صورتِ حال سے زیادہ نالاں رہے اسی لیے ان کی شاعری میں سیاسی منظر کی تصویریں زیادہ دکھائی دیتی ہیں، لیکن باریک بینی سے راحت اندوری کے تمام تر شعری ورثے کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ سیاسی موضوعات و مضامین کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے جڑے متعدد موضوعات و مضامین، تجربات، مشاہدات اور مختلف امور کو اپنی منفرد نظر سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا انداز کارفرما رہا ہے۔ آپ راحت اندوری کے اشعار پڑھیں یا سنیں معاصر شاعری میں ان کی انفرادیت الگ ہی محسوس کریں گے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

تیری ہر بات محبت میں گوارہ کر کے
دل کے بازار میں بیٹھے ہیں خسارہ کر کے

یہ ہوائیں اڑ نہ جائیں لے کے کاغذ کا بدن
دوستو مجھ پر کوئی پتھر ذرا بھاری رکھو

روز پتھر کی حمایت میں غزل لکھتے ہیں
روز شیشوں سے کوئی کام نکل پڑتا ہے

پھونک ڈالوں گا کسی روز میں دل کی دنیا
یہ ترا خط تو نہیں ہے کہ جلا بھی نہ سکوں

اک نہ اک روز کہیں ڈھونڈ ہی لوں گا تجھ کو
ٹھوکریں زہر نہیں ہیں کہ میں کھا بھی نہ سکوں

جب سے تو نے ہلکی ہلکی باتیں کی
یار طبیعت بھاری بھاری رہتی ہے

لوگ ہر موڑ پہ رک رک کے سنبھلتے کیوں ہیں
اتنا ڈرتے ہیں تو پھر گھر سے نکلتے کیوں ہیں

راحت اندوری کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے رنگِ شفق کی طرح انہوں نے اپنے اشعار میں متنوع موضوعات کو چھوا ہے اس طرح متعدد خوبصورت رنگ ابھر آئے ہیں۔ذاتی تجربات ان کے یہاں آ کر جگ بیتی بن گئے ہیں، حالاں کہ سرسری مطالعہ سے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سیاسی صورتِ حال سے زیادہ نالاں رہے اسی لیے ان کی شاعری میں سیاسی منظر کی تصویریں زیادہ دکھائی دیتی ہیں، لیکن باریک بینی سے راحت اندوری کے تمام تر شعری ورثے کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ سیاسی موضوعات و مضامین کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی سے جڑے متعدد موضوعات و مضامین، تجربات، مشاہدات اور مختلف امور کو اپنی منفرد نظر سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا انداز کارفرما رہا ہے۔

موڑ ہوتا ہے جوانی کا سنبھلنے کے لیے
اور سب لوگ یہیں آ کے پھسلتے کیوں ہیں

وہ میرے حکم کو فریاد جان لیتا ہے
اگر یہ سچ ہے تو لہجہ بدل کے دیکھوں گا

میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی
داد لوگوں کی گلا اپنا غزل استاد کی

آگ اوڑھے تھا مگر بانٹ رہا تھا سایہ
دھوپ کے شہر میں ایک تنہا شجر ایسا تھا

وبا نے کاش ہمیں بھی بلا لیا ہوتا
تو ہم پہ موت کا احسان بھی نہیں ہوتا

نیند پچھلی صدی کی زخمی ہے
خواب اگلی صدی کے دیکھتے ہیں

ہمیں بنیاد کا پتھر ہیں لیکن
ہمیں گھر سے نکالا جا رہا ہے

یہ الگ بات کہ خاموش کھڑے رہتے ہیں
جو لوگ بڑے ہیں وہ بڑے رہتے ہیں

ایسے درویشوں میں ملتا ہے ہمارا شجرہ
جن کی ٹھوکر میں کئی تاج پڑے رہتے ہیں

راحت اندوری کی شاعری کے ضمن میں ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ ابھی تک ان کی شاعری قرات سے زیادہ سماعت کی منزل سے گزری ہے یعنی پڑھنے سے زیادہ سنی گئی ہے۔ اخبارات و رسائل میں ان کے اشعار اور غزلیں شاذونادر ہی شائع ہوئی ہوں گی، وجہ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق مشاعروں سے رہا۔ لہٰذا اب ضرورت ہے کہ مطالعہ کی میز سے گزار کر راحت اندوری کی شاعری کا تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تاکہ ان کی شاعری کی انفرادیت ظاہر ہو اور اردو شعر و ادب میں مجموعی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جا سکے۔

□□□

مشاعرے کی دنیا کا محبوب ترین شاعر: ڈاکٹر راحت اندوری

ڈاکٹر داؤد احمد

صدر شعبۂ اردو

فخر الدین علی احمد گورنمنٹ پی جی کالج

محمود آباد، سیتاپور

رابطہ: 8423961475

راحت اندوری عصر حاضر کے مقبول شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ایک فکر کا نام اور مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت اور علامت تھے۔ وہ ایک شخص ہی نہیں بلکہ ایک شخصیت و انجمن تھے۔ وہ کسی ایک ڈھنگ ،ایک فلسفہ، ایک طرز کے شاعر نہیں بلکہ وہ اپنے فن کے ایک آزاد شہسوار اور مشاعروں کی دنیا کے یکتائے روزگار تھے۔ جوان ہو یا بوڑھا، ہندو ہو یا مسلم، دیسی ہو یا پردیسی ہر کوئی اندور کے اس لال کے لہجہ کی گرماہٹ اور آواز کی گھن گرج کا دیوانہ تھا۔ ان کی شاعری ہر عمر اور ہر طبقہ کو محظوظ کرتی تھی۔ان کا لہجہ اس بات کا غماز ہے کہ وہ ایک غیر جانبدار شاعر ہیں۔ بھری محفل میں کڑوا سچ کہنا ان کا خاصا تھا۔نڈر اور جوش ان کے رگ و پے میں رقصاں تھا۔ایسے ہی بے باک شاعر کو اگر مزاحمتی شاعری کا دلدادہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔

راحت اندوری عصر حاضر کے مقبول ترین شاعروں میں شمار کئے جاتے رہے۔ وہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی حیات میں ہی شہرت اور مقبولیت کے آسمان چھو لئے تھے۔ان کی مقبولیت کا راز ان کے شعر پڑھنے کے انداز میں پنہاں تھا۔اپنے منفرد انداز اور جرأت مندلب و لہجے کے باعث وہ نوجوانوں میں بے حد پسند کئے جاتے تھے۔ان کے لہجے کا جوش اور آواز کی گھن گرج سامعین میں ایک شعلہ سا بھڑکا دیتی تھی۔ وہ بے باکی سے اپنا موقف سامنے رکھتے تھے اور یہی وہ صفات تھیں جو ان کو دیگر شاعروں سے ممتاز کرتی تھیں۔

راحت اندوری عوام وخواص ہر طبقہ میں مقبول تھے۔علمی و عوامی ہر طرح کے محفلوں میں کلام پڑھتے تھے اس لیے وہ ہر طرح کے اشعار کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کے اشعار کے الفاظ عام فہم، سلیس اور آسان ہوتے ہیں تو وہیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں معنی خیزی و تہہ داری پائی جاتی ہے جن میں فن کا کمال، جمال وجلال اور غزل کے روایت کی پاسداری بھرپور طور پر پائی جاتی ہے۔ راحت کے اشعار میں اخلاقی بصیرت اور زندگی کی اعلیٰ قدروں سے جذباتی اور والہانہ وابستگی ملتی ہے۔

آزاد روی ، قناعت، استغنائی،توکل و صبر و رضا،ایثار وقربانی ، بے نیازی اورمنکسر المزاجی کے ساتھ ساتھ اولوالعزمی، بوریانشینی و درویشی کے ساتھ ساتھ بادشاہوں والا جاہ و جلال اگرکسی شاعر کے کلام میں موجود ہیں تو وہ ہیں جناب راحت اندوری۔انھوں نے زندگی کو بڑے گہرائی سے برتا ہے۔معاشرہ کے ہر پہلوکو بڑے غور سے دیکھا ہے مطالعہ کیا ہے اور پھر اپنے نقطۂ نظرکو بڑی جرأت واستقامت کے ساتھ برملا اظہار کیا ہے۔میرؔ تقی میرؔ کی طرح راحت اندوری نے بھی موقع پرست سرکاری اور درباری سفہا پرگرفت کی ہے ؎

بن کے اک حادثہ بازار میں آجائے گا
جو نہیں ہوگا وہ اخبار میں آجائے گا
چور اچکوں کی کرو قدر کہ معلوم نہیں
کون کب کون سی سرکار میں آجائے گا

فیض احمد فیضؔ کے بعد اردو شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری کوعوام الناس تک پہنچانے میں جن شعراء نے کلیدی کردارادا کیا ہے ان میں راحت اندوری کی حیثیت نمایاں ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ غیراردوداں طبقے میں اردو غزل کومقبول بنانے میں راحت اندوری کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ان کی عوامی مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے سیکڑوں اشعارضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری کے اندرنہ صرف کلاسیکی اردوغزل کی تہذیب زندہ ہے بلکہ تخلیقیت کی ایک نئی دنیا بھی آباد ہے۔انھوں نے غزل کو نہ صرف موضوعاتی اعتبار سے کائناتی بلکہ شب غم اورغم زیست کا آئینہ بھی بنایا ہے۔لوازمات شعری کا اہتمام ان کا خاصہ رہا اورفن عروض پر اس قدر دسترس حاصل تھی کہ مشاعرے کے اسٹیج پر ہی فی البدیہہ غزل کہہ لیتے تھے۔وہ محفل اورموقع و محل دیکھ کر اشعار پڑھتے تھے اور جہاں جس طرح کے شعر کی ضرورت ہوتی اسے ہی پیش کرتے تھے۔پروفیسر شارب ردولوی نے راحت اندوری کی شاعری اور ان کے شعری اسلوب سے متعلق بڑی اہم اور خاص بات کہی ہے۔" راحت نے شاعری کوایک مکالمہ بنا دیا ہے۔وہ اپنی شاعری کے ذریعہ عوام سے گفتگو کرتے ہیں"۔راحت اندوری کی غزل کے مخصوص انداز کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر شہپر رسول رقمطراز ہیں:

" شاعری دراصل وہی ہے جو اپنی تخلیقی انفرادیت،تازگی اورمعنی خیزی کی بنیاد پرالگ سے پہچانی جاتی ہے۔راحت اندوری کی غزل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو اپنے مخصوص رنگ وآہنگ کی بنا پر اپنا جواز مہیا کرتی ہے"۔

راحت اندوری نے بیس سال کی عمر سے مشاعرہ پڑھنا شروع کیا اور آخر دم تک مشاعرے کی جان بنے رہے۔راحت اندوری نے مشاعروں کے حوالے سے پوری اردو دنیا میں اردو کا پرچم بلند کیا۔ان کی شاعری عام آدمی کی شاعری ہے کیوں کہ وہ آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی محسوس ہوتی ہے۔ جوبھی ڈاکٹر راحت اندوری کا کلام پڑھتا ہے تو اس کومحسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ تو میرے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہے ۔یہ تو میرے دل کی آواز ہے ۔ڈاکٹر راحت کی شاعری میں بڑی دلکشی اوردل آویزی ہے۔سادگی میں بھی انھوں نے پرکاری کا مظاہرہ کیا ؎

دوستی جب کسی سے کی جائے
دشمنوں کی بھی رائے لی جائے

سادگی کے علاوہ انھوں نے کبھی بھی اپنے ضمیر کا سودانہیں کیا۔حق گوئی اور بے باکی کو اپنا شعار بنایا۔راحت اندوری جب مشاعروں میں غزل سرا ہوتے تھے تو ان کو دیکھنا اور ان کے کلام کوسننا کسی تجربہ سے کم نہیں ہوتا تھا۔راحت اندوری جب اپنا کلام پیش کرتے تو لوگوں کو اچھی شاعری سننے کا موقع ملتا تھا ۔راحت اندوری مشاعرہ سننے والوں کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے تھے اوراس کو انھوں نے سلیقے سے برتا بھی اوراس ہنر میں وہ نہایت کامیاب شخص تھے،وہ سلگتے ہوئے موضوعات کوایک سلیقے سے شاعری کا لباس نہ سہی مگر التباس بنانے میں پوری طرح قادر تھے۔ راحت کا کلام اور ان کے پڑھنے کا انداز محفل کوسحر زدہ کر دیتا تھا۔ مشاعروں میں شرکت کے تعلق سے راحت صاحب پوری دنیا کی سیر کرتے رہتے تھے۔اردوشاعری کوانھوں نے اوڑھنا بچھونا بنا دیا۔اس شوق کی وجہ سے گھر کی مختلف نعمتوں کو بھی چھوڑنا پڑااور یوں ان کے پرستاروں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ؎

تمھیں پتہ یہ چلے گھر کی راحتیں کیا ہیں
ہماری طرح اگر چار دن سفر میں رہو

راحت زندگی بھر سفر کرتے رہے۔کبھی اپنے ملک کے مختلف حصوں میں تو کبھی یورپ ،قطر، پاکستان، ابوذہبی، سعودی عربیہ اورکویت ۔اس ادبی سفر نے انھیں شہرت کی اس بلندی تک پہنچایا جس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب وہ موت کی آغوش میں چلے گئے۔

راحت خوب جانتے تھے کہ ادب کیا

ہے،کیوں ہے اور کیسا ہونا چاہیے ۔ایک مشاعرے کے اسٹیج پر شاعری پڑھنے کے درمیان فرمانے لگے!

" آج اتفاق سے میری سالگرہ ہے۔ چوون (۵۴) برس کا ہوگیا ہوں۔ چوون،پچپن برس کے ہونے پر مجھے پتا چلا کہ تیس،پینتیس برس سے میں شاعری کے نام پر ایک تہائی دنیا کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ یہ شاعری ہے ہی نہیں جو میں سنا رہا ہوں۔شاعری تو عشق ہوتی ہے،شاعری صرف عشق ہے۔شاعری تو گڑیا کے ہاتھ کا ترشول نہیں ہے، شاعری روی شنکر کے ہاتھوں کا ستار ہے،مقبول فدا حسین کے ہاتھوں کا برش ہے۔ شاعری اما بھارتی کی تقریر نہیں ہے ، شاعری مہا دیوی ورما کی تحریر ہے، لتا منگیشکر کی آواز کی تاثیر ہے۔ شاعری مودی کا گجرات نہیں ہے ، شاعری منشی پریم چند کا دیہات ہے"۔

(مشاعرہ،ممبرہ،تھانہ 2005)

زمانے کے جبر پر راحت نے بڑی بہادری اور بے باکی سے اظہار خیال کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ راحت اندوری نے صرف تلخ حقائق کو ہی اپنی شاعری کا موضوع بنایا بلکہ وہ تغزل کی شاعری میں دل کے نرم جذبات و احساسات کی بھی ترجمانی کرتے تھے ۔ڈاکٹر راحت صرف مشاعروں کے ہی شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا کلام ملک کے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا۔اپنی یادگار کے طور پر انھوں نے بیوہ،دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے علاوہ " دھوپ بہت ہے" (۱۹۷۹ ء)،" رت" (۱۹۸۳ ء)، "میرے بعد" (۱۹۹۰ ء)، " پانچواں درویش" (۱۹۹۲ ء)،" کن فیکون" (۲۰۰۲ ء)،"لمحے لمحے"،" چاند پاگل ہے" (ہندی)،" دو قدم اور سہی"،" ناراض"،" موجود" وغیرہ اپنے شعری مجموعے چھوڑے ہیں جو یقینی طور پر ان کی نشانی اور یادگار ہیں۔غرض کہ نصف صدی تک مشاعروں کی دنیا کے بے تاج بادشاہ رہے۔انھوں نے فلم کا رخ کیا تو وہاں بھی انھوں نے اپنی پہچان قائم رکھی۔فلم" منا بھائی ایم بی بی ایس کا گیت" ایم بولے تو"۔فلم" قریب" کا گیت "چوری چوری جب نظر ملی" اور فلم "گھاتک" کا گیت" کوئی جائے تو لے آئے" اس کے علاوہ فلم "نیند چرا لی"" بیگم جان"" مرڈر"" خوف اور آرزو" اور" تمنا" جیسی کامیاب فلموں میں ان کے گیت مقبول ہوئے۔ راحت صاحب نے نہ صرف بالی ووڈ فلموں کے لئے نغمہ نگاری کی بلکہ گلوکاری کے کئی سوز میں بطور جج حصہ بھی لیا۔راحت اندوری نے فلمی دنیا کو اپنے فلمی نغموں کے سبب ساحر لدھیانوی کی طرح وقار و اعتبار بخشا۔ گھاتک،عشق، منا بھائی ایم بی بی ایس اور خوددار فلمیں اس حوالے سے ان کی یادگار قرار دی جائیں گی۔خوددار فلم کا نغمہ' تم سا کوئی پیارا کوئی معصوم نہیں' نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔مست قلندر راحت اندوری سیلانی مزاج رکھتے تھے۔ پوسٹر سازی اور تصویر کشی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔عصری،سیاسی وسماجی ماحول اور مسائل کو موضوع بنانے کی روایت جہاں دیگر شعرا کے یہاں کمزور دکھائی دیتی ہے وہیں راحت کے ہاں یہ ہنر بہت عروج پر تھا۔جس موضوع کو بھی سخن میں ڈالا اس کا حق ادا کیا۔ستھری زبان ،دلکش انداز بیان اور راست گوئی ان کے فن کی خاص خوبی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

ایک ہی ندی کے ہیں یہ دو کنارے دوستو
دوستانہ زندگی سے موت سے یاری رکھو

میں اگر دشمنوں میں بس گیا ہوں
یہاں ہمدرد ہیں دو میرے

اسکی یاد آئی ہے سانسو ذرا آہستہ چلو
دھڑکنوں سے بھی عبادت میں خلل پڑتی ہے

راحت اندوری اپنی شاعری کے ذریعے مجبوروں اور مقہوروں کے دل کی ترجمانی کی،قوم میں بیداری کی روح پھونکی۔ان کی شاعری مشترکہ تہذیب وتمدن کی سالمیت کا ضامن ہے۔ان کی شاعری میں اگر عشق ومحبت کی راگ راگنیاں ہیں تو وہیں تلواروں کی جھنکار بھی ہے ۔کبھی تلواروں کی جھنکاروں میں عشق ومحبت کے نغمے گھل مل جاتے ہیں تو کبھی عشق ومحبت کی راگ میں شعلہ ابلتا ہے پھر ان شعلوں میں کن کے محل خاکستر ہوئے،کس کی پگڑی جل گئی،کس کے اقدار کی کرسی خاکستر ہوئی،کس کا دامن داغدار ہوا،کون شرمشار ہوا راحت کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ سیدھے رستے کا مسافر بنے رہے۔دوست ودشمن،جاہ ومرتبہ،مال ودولت کی کبھی پرواہ نہیں کی،جو بھی کہا،لکھا اس لیے کہا لکھا کہ وہ ایک پر امن معاشرہ ، پاکیزہ سیاست، مشترکہ تہذیبی ورثہ کی حفاظت چاہتے تھے۔ان عظیم مقاصد کے سامنے ہوتے ہوئے بھی جب بھی شعر کہنے بیٹھے تو شاعری کی آبرو کی حفاظت کی۔شعری رنگ و آہنگ اور اسلوب کو فرسودہ ہونے نہیں دیا اس کے برعکس لفظوں کے انتخاب،

ترنم و آہنگ، سلاست و فصاحت، تشبیہ و استعارہ کا موزوں انتخاب نے ان کی شاعری کو لازوال سرمایہ بنا دیا۔

راحت اندوری کی کامیابی کا راز ان کی شاعری کی معنویت اور مخصوص تحت اللفظ، ادائی شعر دونوں کا امتزاج ہے۔ وہ پھول کی پتی سے ہیرے کے جگر کو کاٹنے کا فن سے خوب واقف ہیں۔ وہ خطرناک حد سے نازک مسائل اپنے شعر میں باندھتے ہیں اور انھیں بڑی بے جگری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے شعر اور ادائیگی شعر میں مکمل یگانگت پائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی فکر میں ترقی پسند ہیں لیکن اظہار میں وہ جدید ہیں ؎

روایتوں کی صفیں توڑ کر بڑھو ورنہ
جو تم سے آگے ہیں وہ راستہ نہیں دیں گے

لوگ ہر موڑ پہ رک رک کے سنبھلتے کیوں ہیں
اتنا ڈرتے ہیں تو پھر گھر سے نکلتے کیوں ہیں

عام طور پر راحت اندوری کو گھن گرج اور جاہ و جلال کا شاعر سمجھا جاتا ہے بلکہ ان کی شبیہ ایک رومان مخالف کردار کی ہے لیکن ان کے یہاں عشق و رومان کے امڈتے جذبات بھی خوب ملتے ہیں جس کی سرشاری، محبت کا وفور، والہانہ شیفتگی و فریفتگی سبھی کچھ راحت اندوری کے اشعار میں مل جاتے ہیں۔ ان کی رگوں میں بغاوت اور مزاحمت کے شرارے ہی نہیں بلکہ دلکش و دلربا معشوق کی محبتیں بھی دوڑتی ہیں ؎

تیری ہر بات محبت میں گوارہ کر کے
دل کے بازار میں بیٹھے ہیں خسارہ کر کے
آتے جاتے ہیں کئی رنگ ترے چہرے پر
لوگ لیتے ہیں مزہ ذکر تمھارا کر کے

راحت اندوری جہاں ایک طرف ایک باغی اور جارحانہ شاعر بن کر ابھرتے ہیں تو دوسری طرف ان کی شاعری میں تخلیقیت اور کلاسیکیت کا ایک بہترین امتزاج بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر مشتاق احمد رقمطراز ہیں:

"راحت اندوری کی شاعری کے اندر نہ صرف کلاسیکی اردو غزل کی تہذیب زندہ ہے بلکہ تخلیقیت کی ایک نئی دنیا بھی آباد ہے۔ انھوں نے غزل کو نہ صرف موضوعاتی اعتبار سے کائناتی بلکہ شب غم اور زیست کا آئینہ بھی بنایا ہے"۔

راحت اندوری لفظوں کے جادوگر تھے۔ انھیں لفظوں کے برتنے کا ہنر خوب آتا تھا۔ وہ سیدھی سادی عام فہم زبان میں سامعین تک اپنی بات، اپنا پیام بڑی مہارت اور چابکدستی سے پہنچایا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے شعر ایک عام آدمی کو بھی آسانی سے سمجھ میں آتے تھے۔ ایک مدت کے بعد سامعین نے ایک ایسے شاعر کو دیکھا جو سامنے والے کی آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کرتا تھا اور اپنی پرجوش و ولولہ انگیز شاعری کے کے ذریعہ مشاعروں کو لوٹ لیا کرتا تھا۔ ان کے اکثر اشعار مطلب اور مقصد سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ وہ تعمیری اور مقصدی شاعری پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے شعروں کے ذریعہ معاشرے کی دکھتی رگ پر عمومی طور پر نشتر زنی کی ہے۔ انھیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ ان کی اس بے باکی اور دیدہ دلیری کی وجہ سے کتنے لوگ ان کے خلاف ہو گئے ہیں۔ سچ اور حق کے لیے راحت انجام کی پروا کئے بغیر بھڑ جایا کرتے تھے۔ حوصلہ اور جواں مردی انھیں وراثت میں ملی تھی۔ اندور میں ان کا بچپن گزرا۔ لڑکپن سے مشکلوں اور مصیبتوں نے آ گھیرا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور بعد میں پی ایچ ڈی کی باوقار ڈگری بھی حاصل کی۔ حالات کے ان پیچ و خم، نشیب و فراز اور کٹھنائیوں کے ساتھ ان کا شعری سفر شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کا شعری شعور بہتر سے بہترین ہوتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا شمار بین الاقوامی شعرا میں ہونے لگا اور وہ مشاعروں کی ضرورت بن گئے۔ ان کے اشعار اس قدر پرکشش و لاجواب ہیں کہ جنھیں بار بار سننے اور گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ انھیں اپنے وطن سے بے حد پیار تھا جس کا ثبوت ان کے بہت سے اشعار سے ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں جنھیں پڑھ کر خون کی روانی میں تیزی اور دماغ میں ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے ؎

لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے
ہمارے منھ سے جو نکلے وہی صداقت ہے
ہمارے منھ میں تمھاری زبان تھوڑی ہے
جو آج صاحب مسند ہیں کل نہیں ہوں گے
کرائے دار ہیں ذاتی مکان تھوڑی ہے
آنکھ میں پانی رکھو ہونٹوں پہ چنگاری رکھو
زندہ رہنا ہے تو ترکیبیں بہت ساری رکھو
میں مر جاؤں تو میری اک الگ پہچان لکھ دینا
لہو سے میرے پیشانی پہ ہندوستان لکھ دینا
ہم اپنی جان کے دشمن کو اپنی جان کہتے ہیں
محبت کے اسی مٹی کو ہندوستان کہتے ہیں

راحت اندوری عصر حاضر کے نہایت مقبول شاعر ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی باڈی لینگویج کے ساتھ شعر سناتے ہیں۔ مشاعرہ

کو کس طرح لوٹا جاتا ہے وہ اس فن سے خوب واقف ہیں۔ سامعین انھیں بار بار سنانے کی فرمائش کرتے رہتے ہیں اور وہ سناتے رہتے ہیں۔ راحت اندوری اردو شاعری کا بہت بڑا نام ہے اس لیے کہ انھوں نے نہ صرف ملک کے مختلف علاقوں میں مشاعرہ پڑھا ہے بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں بھی مشاعرہ پڑھتے آئے ہیں۔ صرف تین دہائیوں کے شعری سفر میں راحت نے بڑی تیزی سے عالمگیر شہرت اور عروج حاصل کر لیا ہے۔ ہندوستان سے زیادہ غیر ملکی ممالک میں راحت نے اپنی بے باک شاعری اور انداز بیان سے کروڑوں دلوں پر راج کیا ہے۔ راحت اندوری کے کچھ انوکھے اور تیکھے بول ملاحظہ فرمائیں ؎

جو منصبوں کے پجاری پہن کے آتے ہیں
کلاہ طوق سے بھاری پہن کے آتے ہیں
امیر شہر! تری طرح قیمتی پوشاک
مری گلی میں بھکاری پہن کے آتے ہیں
ہماری جسم کے داغوں پہ تبصرہ کرنے
قمیضیں لوگ ہماری پہن کے آتے ہیں
یہ مسندوں کی سیاست سیاہ چشمہ ہے
جسے امام بخاری پہن کے آتے ہیں
عبادتوں کا تحفظ بھی ان کے ذمے ہے
جو مسجدوں میں سفاری پہن کے آتے ہیں

قلندر مزاج ، رواداری کا خیال رکھنے والے شہرۂ آفاق شاعر راحت اندوری کو کبھی کسی سرکاری مرعات ، منصب، عہدے یا کسی سرکاری ایوارڈ کے لیے کسی صاحب اختیار کو مکھن لگاتے نہیں پایا گیا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک کامیاب شاعر ہیں۔ راحت اندوری دراصل ایک قلندرانہ تیور کا نام ہے ؎

ایک حکومت ہے جو انعام بھی دے سکتی ہے
اک قلندر ہے جو انکار بھی کر سکتا ہے
ہم پہ حاکم کا کوئی حکم نہیں چلتا ہے
ہم قلندر ہیں شہنشاہ لقب کرتے ہیں
فقیر، شاہ، قلندر امام کیا کیا ہے
تجھے پتا نہیں تیرا غلام کیا کیا ہے

ڈاکٹر راحت اندوری مشاعرے کی دنیا کے محبوب ترین شاعر تو تھے ہی فلم کے لیے بھی کامیاب نغمے لکھے۔ درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے، مصوری بھی کی۔ نازک انسانی جذبوں پر ان کی زبردست پکڑ ، سیاست کے ڈھونگ کو بے نقاب کرنے کا بے خوف انداز اور ہم عصر سماجی معاملات کو کھنگالنے کی ان کی دلکش ادا مشاعروں کو ایک نئی بلندی تک لے جاتی تھی۔ ایک طرف تو آپ ظلم و ناانصافی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے احتجاجی شاعر نظر آتے ہیں تو دوسری طرف غزل سرائی کرتے ہوئے میرؔ و غالبؔ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں ، کہیں نوجوانوں کے حوصلے اور ہمت کو مہمیز دیتے ہوئے علامہ اقبال کے بھیس میں نظر آتے ہیں تو کہیں نعت نبی پڑھتے ہوئے ایک سچے عاشق رسول کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں ؎

اگر نصیب قریب در نبی ہوجائے
میری حیات مری عمر سے بڑی ہوجائے
میں 'م' 'ح' لکھوں پھر 'م' اور 'د' لکھوں
خدا کرے کہ یونہی ختم زندگی ہوجائے

کرونا جیسی وبائی بیماری کے اثرات سے وہ بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اپنی آخری غزل اسی وبا پر تحریر کی۔ انھیں اس بات کا علم تھا کہ وبائی بیماری میں اگر کوئی انسان جاں بحق ہوجاتا ہے تو اسے شہادت کا درجہ ملتا ہے۔ شاید اسی لیے انھوں نے کہا :

وبا نے کاش ہمیں بھی بلا لیا ہوتا
تو ہم پہ موت کا احسان بھی نہیں ہوتا

راحت اس وبا کا شکار ہوگئے کسی کا احسان لیے بغیر۔ جسمانی طور پر اگر چہ راحت اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن شاعری کی صورت میں وہ اپنے پرستاروں کے لیے جو اثاثہ چھوڑ گئے ہیں وہ غالب کی طرح انھیں رہتی دنیا تک زندہ رکھے گی۔ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں ، سیاستدانوں کی گھناونی سیاست ، فرقہ پرستی ، مظلومیت اور استحصال پر اپنی شاعری کے ذریعے اپنے فائدے کو نظر انداز کرتے ہوئے انھوں نے طنز کے جو تیر پھینکے ہیں وہ ان کے انقلابی شاعر ہونے کا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ اعزازات و انعامات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اردو شاعری میں انھوں نے جو تجربے کئے ہیں ان کا محاسبہ کرنے کی اشد ضرورت ہے تا کہ جدید اردو شاعری میں ان کے مقام و مرتبہ کو متعین کیا جا سکے۔ ناقدین نے اگر چہ ان کی زندگی میں ان کے فن کی پرواہ نہیں کی لیکن ان کی موت کے بعد ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی شاعری کے نہ صرف موضوعات سے بحث کریں بلکہ فنی باریکیوں کو بھی اجاگر کرنے کا کام سرانجام دیں۔

راحت صاحب ہمارے بیچ سے چلے گئے ہیں لیکن ان کا لہجہ، ان کا اسلوب اور ان کی شاعری ابھی بھی زندہ ہے اور آگے بھی زندہ رہے گی:

جنازے پر میرے لکھ دینا یارو
محبت کرنے والا جا رہا ہے

❑❑❑

راحت اندوری انانیت کا شاعر

ڈاکٹر آفتاب عرشی

ہنسور

امبیڈکر نگر

یو پی

رابطہ: 9440936810

ہمارے منھ سے جو نکلے وہی صداقت ہے
ہمارے منھ میں تمہاری زبان تھوڑی ہے

کہا جاتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہے لیکن جب وہ شاعری کرتا ہے تو اسے اپنی شاعری میں سچ بولنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کی زندہ رہنے کے لئے سانس کا، تبھی وہ ایک سچا فن کار ثابت ہوسکتا ہے اور اپنے فن کے ساتھ انصاف کرسکتا ہے۔ بلاشبہ راحت اندوری نے اپنے فن کے ساتھ دیانت داری کی، جس کی وجہ سے دنیا سے جاتے جاتے اردو ادب میں ایک باب اپنے نام کر گئے۔

ادب کا ایک طبقہ راحت کو مشاعرے کا شاعر کہتا ہے، راحت بازارو شاعر ہے، راحت انقلابی شاعر ہے، راحت عوامی شاعر ہے، راحت ادبی شاعر ہے، وغیرہ وغیرہ۔ راحت کی شخصیت پر لوگوں نے اپنی اپنی پسند کا لیبل چسپا کیا۔ مگر میرے نزدیک راحت صرف ایک سچا شاعر ہے اور یہی اس کی پہچان کے لئے کافی ہے۔ اب رہا سوال راحت اندوری کی شاعری کا، تو راحت اندوری کی شاعری کا سب سے مثبت پہلو یہ ہے کہ راحت کی شاعری کا خمیر راحت کی انانیت سے تیار ہوا ہے۔ یہ اور بات کہ اس انانیت میں کہیں انقلاب کی آواز بلند ہے تو کہیں احتجاج کا پرچم عروج پر ہے۔ کہیں انکار کا جذبہ ہے تو کہیں عشق کا احساس جواں ہے۔ گویا راحت اندوری کی شاعری کے کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ میں ان کی انانیت کی خوشبو کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

انانیت کا جذبہ کسی بھی شخص میں تبھی پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ سچ کو سچ کہنے کی ہمت رکھتا ہو وہ بھی اس ذمے داری کے ساتھ کہ آنے والی نسلیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سچ سے انجان رہ جائیں راحت نے اپنی فن کاری سے تاریخ رقم کی ہے۔ ظاہری بات ہے یہ ایک مشکل کام ہے۔ کہ اپنے فن کا ثبوت بھی دینا اور سچ کو بھی پیش کرنا، اس سلسلے میں راحت کے سیکڑوں شعر پیش کئے جاسکتے ہیں مگر یہاں صرف ایک شعر پر اکتفا کیجئے:

قلمکارو! سیاسی ظلم کی روداد لکھ دینا
قیامت جب بھی لکھنا ہو احمد آباد لکھ دینا

میرے محدود مطالعہ کے مطابق گجرات (احمد آباد) کے فساد کے حوالے سے راحت کے اس شعر سے بڑا شعر میری نظر سے نہیں گزرا۔ جب کہ گجرات (احمد آباد) کے فساد کے متعلق تمام شعرا کی نظمیں، غزلیں، طویل نظمیں، قطعات وغیرہ مطالعہ میں آئے مگر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ راحت اندوری کا یہ شعر اس پس منظر میں سب سے اوپر نظر آتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو بھرپور شعریت ہے۔ قیامت کو احمد آباد کی تباہی و بربادی کے استعارہ میں نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ جو اپنے خالق کے بڑے فن کار ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

راحت اندوری کی آواز دور سے تو ایک نعرہ بازی معلوم ہوتی ہے مگر محسوس کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نعرہ نہیں بلکہ وہ سلگتے ہوئے زخم ہیں جس کا علاج نہیں انھیں تمام زخموں میں ایک زخم یہ بھی ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی صورت حال کی طرف راحت نے جس بے باکی سے اشارہ کیا ہے اس کا کوئی جواب نہیں:

اب کے جو فیصلہ ہوگا وہ یہیں پر ہوگا
ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی

اسی بے باک لہجہ کی وجہ سے راحت کو بدنام شاعر لوگ تسلیم کرنے لگے۔ جو بہت حد تک صحیح بھی ہے۔

اسی سچ اور بے باکی کی وجہ سے راحت اندوری کو ہندوستان کی حکومت نے کبھی کوئی اعزاز یا ایوارڈ سے نہیں نوازا مگر اس پر بھی راحت کو کوئی ملال نہیں اپنی اَنا کے لہجہ میں اعتراف کرتے ہیں:

ایک حکومت ہے جو اعزاز بھی دے سکتی ہے
ایک قلندر ہے جو انکار بھی کرسکتا ہے

انکار کا یہ جذبہ کسی شاعر یا ادیب کے اندر ایسے ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے لئے وسیع ذہن کے ساتھ ساتھ دل بڑا ہونا چاہئے۔ جو راحت کے پاس تھا ورنہ اعزاز وایوارڈ کے لئے اس عہد میں لوگ کیا کیا نہیں کرتے یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ویسے بھی راحت نے کبھی ایوارڈ و اعزاز کے لئے شاعری نہیں کی، بلکہ اپنے فن کے ذریعے سے لوگوں کے دلوں کی آواز کو شعری پیرائے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ پوری طرح کامیاب بھی ہیں۔ تبھی تو کہا ہے:

ہمارے منھ سے جو نکلے وہی صداقت ہے
ہمارے منھ میں تمہاری زبان تھوڑی ہے

یہ شعر جہاں ایک طرف آج کے سیاست داں کے کردار کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہیں ایک فن کار کے سچ کو بھی پیش کررہا ہے۔ اسی سچ کی بدولت راحت نے اپنی اہمیت کو کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے:

شاخوں سے ٹوٹ جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے

یہ سچ بولنے کا ہی نتیجہ ہے کہ راحت کا اعتماد یقین میں بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس میں زمانے کی آواز کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جو اپنے عہد کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔ تبھی تو راحت کا یقین اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ انھیں کہنا پڑ گیا:

ہمیں حقیر نہ جانو ہم اپنے نیزے سے
غزل کی آنکھ میں کاجل لگانے والے ہیں

ظاہری بات ہے کی آنکھ میں کاجل لگانا وہ بھی نیزے سے یہ کوئی آسان کام نہیں بلکہ نہایت ہی ہنرمندی کا کام ہے جس میں راحت ماہر ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی کبھی حکومت کو بھی للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں:

امیرِ شہر تیری طرح یہ قیمتی پوشاک
میری گلی میں بھکاری پہن کے آتے ہیں

یہ وہ احساسات ہیں جن میں انانیت جگہ جگہ صاف طور پر نظر آتی ہے۔ یا پھر حکومت کی آنکھ میں آنکھ ملا کر ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

تمہارے دور میں سنسد بھون ہے جس کا نام
ہمارے دور میں ہوتا تو اصطبل ہوتا

اردو شاعری میں بہت کم شعرا ہیں جس کے یہاں اتنا تیکھا تیور ملتا ہو، وہ بھی اتنے پر اعتماد لہجے میں، یہ کارنامہ راحت سے شروع ہو کر انھیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے راحت یہ بھی کہنے پر مجبور ہیں کہ:

اب کہاں ڈھونڈنے جاؤ گے ہمارے قاتل
آپ تو قتل کا الزام ہمیں پر رکھ دو

راحت ہندوستان کی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ سیاست جس میں نفرت (فرقہ وارانہ) کی بو کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اس لئے راحت کو اپنے قتل کا الزام خود پر ہی لینا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ مگر راحت کو ہندوستانی تہذیب پر پورا بھروسہ ہے اسی لئے کہتے ہیں:

ہم اپنی جان کے دشمن کو اپنی جان کہتے ہیں
محبت کی اسی مٹی کو ہندوستان کہتے ہیں

وہ مٹی جس میں سبھی کا خون شامل ہے، جس کو سنوارنے میں سبھی کا ہاتھ ہے۔ چاہے وہ

کسی بھی دھرم کسی بھی قوم کا ہو، یعنی کہ محبت کی مٹی کا نام ہندوستان ہے۔ یہ الگ بات کہ سیاست داں طبقے نے فرقہ وارانہ حصے میں معاشرے کو بانٹ دیا، جن میں نفرت کی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ایسی صورت حال میں سیاست داں کو راحت کا ایک شعر آئینہ دیکھا تا ہوتا ہے:

سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

حالاں کہ راحت کے آخری ایام میں یہ شعر ان کی بدنامی کا سب سے زیادہ سبب بنا، اس کی وجہ کچھ اور نہیں بلکہ وہی انانیت ، اور سچ بولنے کا جذبہ ہے اور کچھ نہیں، ظاہری بات ہے سیاست داں کو سچ اتنی آسانی سے کہاں ہضم ہوتا ہے یہ تو ہم اور آپ بہتر طور پر جانتے ہیں۔

راحت اندوری کے فن میں انانیت کا خاصا کردار ہے۔ جو ان کے لہجہ کی پہچان بھی ہے۔ راحت کے یہاں عشق کا تصور اسی دنیا کا ہے جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں ایک جیتا جاگتا عشق، مگر راحت نے اپنے عشق کے جذبے میں بھی اپنی انانیت کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسی انانیت سے اپنے عشق کے جذبے کو جلا بخشی۔ جب کہ حقیقت تو یہ ہے جہاں عشق ہوتا ہے وہاں کچھ اور ہو مگر انانیت (مَیں) کی گنجائش نہیں۔ تاہم راحت کا عشق وصل کے لذت سے ہو کر ہجر پر تمام ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے:

وہ مجھ کو چھوڑ گیا یہ کمال ہے اُس کا
ارادہ مَیں نے کیا تھا کہ چھوڑ دونگا اُسے

شاعر کا محبوب، شاعر کو چھوڑ کر چلا گیا، اب اس ہار کو شاعر نے بڑے سلیقے سے شعری پیرائے میں ڈھال کر اُسے اپنی جیت میں بدل دیا ہے۔مگر جب یہ احساس ہوا کہ واقعی میرا محبوب چھوڑ کر چلا گیا ہے۔تو شاعر یہ کہنے پر مجبور نظر آرہا ہے:

مَیں وہ دریا ہوں کہ ہر بوند بھنور ہے جس کی
تُو نے اچھا ہی کیا مجھ سے کنارا کر کے

شاعر اپنے اندر کی الجھن سے دو چار ہو کر محبوب کے بچھڑنے کو الزام تراشی نہیں بلکہ اس کی ذہانت کی داد دینے پر مجبور ہے۔مگر جب وہی محبوب پوری طرح سے بچھڑ جاتا ہے اور یہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ اب وہ پلٹ کر نہیں آنے والا، شاعر ایک بار پھر نئے تجربے سے دو چار ہو کر اپنی انانیت کا سہارا لیتا ہوا نظر آتا ہے۔اور کہنے پر مجبور ہوتا ہے:

مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی کہاں اب پہلے جیسی ہے
پھیکے پڑ گئے کپڑے، وپڑے، زیور، ویورسب

یہاں شاعر اپنی تمام عشق کی ناکامیوں کو چھپانے کے لئے محبوب کی کیفیت بیان کر رہا ہے۔ بہرحال راحت کا عشق ان کے فن کے مطابق ایک ادھورا عشق رہا ہے۔جو ان کی شاعری کے آئینے میں صاف طور پر نظر آرہا ہے۔عشق کے رشتے کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں وہ یہ بھی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

رشتوں کی دھوپ چھاؤں سے آزاد ہوگئے
اب تو ہمیں بھی سارے سبق یاد ہوگئے

یہ وہ سبق ہیں جو عمر کے آخری ایام میں تجربے کی صورت میں ہر کسی کو یاد ہوتے ہیں۔سو راحت کو بھی یاد ہوگئے۔اور زندگی کی حقیقت کو پہچاننے لگے۔اس کا ثبوت کچھ اس انداز میں دیا ہے:

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا

خود انسان اگر کوشش نہ کرے تو اس کی پریشانی دور نہیں ہوسکتی۔یہ وہ تجربات ہیں جو راحت نے شعری پیکر میں ڈھال کر بے مثال کر دیا ہے۔چند اشعار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ اگر ان کی تشریح کی جائے تو ان کا حسن مجروح ہوجاتا ہے۔کیوں کہ ان کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ تشریح کرنے پر وہ اپنا حسن کھودیتے ہیں۔جیسے یہ شعر:

روز پتھر کی حمایت میں غزل کہتا ہوں
روز شیشوں سے کوئی کام نکل پڑتا ہے

جب استعارہ علامت کے پیکر میں ڈھل کر اپنے عرفان کی منزل طے کرتا ہے۔تو شعر کی معنویت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوجاتا ہے جیسے کہ راحت کے اس شعر میں پتھر اور شیشے میں معنویت کا وسیع دائرہ ہے۔استعارے کو علامت کے پیکر میں پیش کرنا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کو اپنے فن پر پوری طرح گرفت حاصل ہے۔

بہرحال راحت اندوری ۱۱؍اگست ۲۰۲۰ء ابھی حال ہی میں ۷۰؍برس کی عمر میں اپنے تمام چاہنے والوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔جس کا ملال ابھی تک اردو حلقوں میں جاری ہے۔ان کے انتقال پر اس ناچیز نے (ڈاکٹر آفتاب عرشی) تعزیتی قطعہ لکھا، جو آپ سب کی خدمت میں پیش ہے۔

جہانِ ادب کا سمندر تھا راحتؔ
جو مَیں سچ کہوں تو قلندر تھا راحتؔ
وہ بے باک لہجہ صداقت میں ڈوبا
غزل کے جہاں کا سکندر تھا راحتؔ

❑❑❑

زیبؔ غوری و راحتؔ اندوری کی دو منفرد غزلیں

ڈاکٹر امین احسن

محلہ قاضی پورہ
ٹانڈہ
امبیڈکر نگر
رابطہ: 9839745971

تغیر اور تبدّل ایک ایسا عمل ہے جس کا سلسلہ تخلیقِ کائنات یعنی روزِ اوّل سے ہی جاری ہے۔انسانی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر دور میں تبدیلی ہمارے سماج کا بنیادی اور اہم حصّہ رہی ہے اور یہ تبدیلی ہمارے شعبہ ہائے زندگی میں مختلف سطحوں پر مسلسل اور تواتر کے ساتھ ہوتی رہتی ہے۔جن کے اثرات کی نشاندہی بڑی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ہمارا رہن سہن ، بودوباش،طرزِ تخاطب واظہار اور اندازِ بیان وغیرہ بھی اس سے اچھوتے نہیں رہ سکتے۔ایک بات اور جو بہت عام ہے وہ یہ کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے یا ادب اور زندگی میں چولی دامن کا رشتہ ہے تو دوسری بات یہ ہے کہ زندگی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اور نت نئی ایجادات کے سہارے آگے بڑھ رہی ہے۔اس کے مثبت اور منفی اثرات کا عکس ہر جگہ صاف طور پر دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اگر بات زبان وادب کی کی جائے تو اس شعبے میں بھی کچھ نہ کچھ نئے تجربے کیے گئے ہیں اور کیے جارہے ہیں۔ان کی تردید وتوثیق کے نمونے دستاویزی شکل میں موجود ہیں۔مختلف اصنافِ سخن میں تجربات کا سلسلہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔چاہے کہانی ہو یا داستان نویسی ، ناول ہو یا افسانہ نگاری، ڈرامہ ہو یا سفرنامہ، خودنوشت ہو یا سوانح نگاری، خطوط نویسی ہو یا تمثیل نگاری، مزاح نگاری ہو یا خاکہ نگاری، انشائیہ ہو یا رپورتاژ، نظم گوئی ہو یا مثنوی نگاری، مرثیے کا فن ہو یا نعت گوئی، قطعات ہوں یا رباعیات، فنِ قصیدہ نگاری ہو یا غزل کی ریزہ خیالی۔تقریباً ہر صنفِ سخن میں کوئی نہ کوئی تبدیلی اور نئے تجربے کیے گئے ہیں۔یہ تبدیلی موضوعات میں بھی کی گئی ہے اور فن میں بھی۔لفظی اصطلاحات میں بھی کی گئی ہے اور استعاروں و کنایوں میں بھی۔تراکیب میں بھی کی گئی ہے اور ہیئت میں بھی۔غرض یہ کہ تبدیلی کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔

اردو غزل ابتدا سے عصرِ حاضر تک تبدیلی کے مراحل سے گزرتی جارہی ہے اور نقشِ دوام بناتی چلی جارہی ہے۔زلفِ گرہ گیر کی اسیری اور حسن وعشق کے معاملات ،تصوف کی چاشنی وفلسفیانہ خیالات کی آمیزش کے ساتھ عصری مسائل جیسے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے

زبان کی رنگارنگی کو برتتے ہوئے روز افزوں ترقی سے ہم دوش وہم کنار ہوتی جارہی ہے۔لفظ کی جوہری توانائی کے تسلسل اور امکانات کے نئے دروبست وا کرتی ہوئی گل کاری کرتی جارہی ہے۔کلاسیکی غزل،جدید غزل اور جدید تر غزل میں اس کے مظاہر صاف طور پر دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں۔دبستانِ دکن،دبستانِ دہلی ،دبستانِ لکھنؤ ،دبستانِ رام پور وعظیم آباد وغیرہ میں زبان وبیان کی درستگی،سلاست وروانی، فصاحت وبلاغت اور لفظوں کے معنی ومفاہیم کو حسن اور سلیقے کے ساتھ برتنے کے ہنر پر کافی زورآزمائی وکد وکاوش کے نتیجے میں ادب میں گراں قدر اضافے کیے گئے ہیں۔

اُردو غزل میں نئی لفظی تراکیب واصطلاحات کا استعمال سب سے زیادہ کیا گیا ہے۔اسی لیے یہ صنف ہمیشہ طرب خیزی وتازہ کاری سے مالامال ہوتی رہی ہے۔ابتدا میں اردو نظم میں مہمل الفاظ کا استعمال شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ہماری ادبی تاریخ میں بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک ''تابع مہمل کی اصطلاح'' کے مستعمل ہونے کی روایت کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ہے۔البتہ شروع سے ہی کہیں کہیں نثری تصانیف میں اس کے استعمال کے دھندلے نقوش ملتے ہیں۔لیکن اردو غزل میں اس اصطلاح کا استعمال بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں باقاعدہ طور پر فنی مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اس اصطلاح کے استعمال پر بحث کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ اس کی تعریف پر ایک نظر ڈالی جائے۔اُردو لغت میں تابع مہمل کی اصطلاح کی تعریف اس بے معنی لفظ سے مراد ہوتی ہے جو کسی بامعنیٰ لفظ کے فوراً بعد آتا ہے۔عموماً بامعنیٰ لفظ کے حرفِ اوّل کو 'و' سے بدل دیتے ہیں اور باقی حروف اصل لفظ کے ہی ہوتے ہیں۔مثلاً کتاب وتاب،قلم ولم،دوات ووات،نصاب وصاب، نشتر وشتر، کام وام،نام وام وغیرہ۔اس کی مزید شکلیں بھی ممکن ہیں۔اس لیے اس تعریف کو کسی حد تک مکمّل کہا جاسکتا ہے۔کبھی کبھی بامعنیٰ لفظ سے

اُردو غزل میں نئی لفظی تراکیب و اصطلاحات کا استعمال سب سے زیادہ کیا گیا ہے۔اسی لیے یہ صنف ہمیشہ طرب خیزی وتازہ کاری سے مالامال ہوتی رہی ہے۔ابتدا میں اردو نظم میں مہمل الفاظ کا استعمال شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہماری ادبی تاریخ میں بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک ''تابع مہمل کی اصطلاح'' کے مستعمل ہونے کی روایت کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ہے۔البتہ شروع سے ہی کہیں کہیں نثری تصانیف میں اس کے استعمال کے دھندلے نقوش ملتے ہیں۔لیکن اردو غزل میں اس اصطلاح کا استعمال بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں باقاعدہ طور پر فنی مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مہمل لفظ بالکل جدا ہوتا ہے اور اس کی ہیئت بھی مختلف ہوتی ہے، جیسے چوری چکاری، چھیڑ چھاڑ، توتڑاک وغیرہ۔کبھی کبھی یہ واؤ کے بجائے 'ش' سے شروع ہوتا ہے، جیسے اناپ شناپ وغیرہ۔اس کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ دونوں لفظ مہمل نہیں بلکہ بامعنیٰ ہوتے ہیں جیسے دال دلیہ، دوا دارو، توڑ مروڑ، دم درود وغیرہ۔ اس کے برعکس کبھی کبھی دونوں ہی لفظ مہمل ہوتے ہیں جیسے تتر بتر، اوبڑ کھابڑ، اول فول، اُتھل پتھل، اللے تللے وغیرہ۔اس کی ایک شکل اور ہوتی ہے جس میں پہلا لفظ مہمل اور دوسرا لفظ بامعنیٰ ہوتا ہے جیسے انجر پنجر، مین میخ وغیرہ۔

مہمل لفظ بنانے اور اس کے استعمال کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ بیان میں مزید زور پیدا کیا جائے اور معنویت میں اضافہ کیا جائے۔لفظ اور مہمل کے باہمی اشتراک سے کئی لفظوں کی پردہ داری بھی ہوتی ہے اور دیکھا جائے تو ایک طرح سے مختلف وضاحت طلب الفاظ ذہن کے پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوکر معنی ومطالب کے کئی جہان بھی آباد کرتے ہیں۔مثلاً جب میزبان اپنے مہمان سے دریافت کرتا ہے کہ پانی وانی پیا یا روٹی ووٹی کھائی کہ نہیں تو اس کے پسِ پردہ دسترخوان پر موجود پانی کے دیگر لوازمات جیسے لڈّو، برفی اور رس گلّہ وغیرہ اور روٹی کے متعلقات جیسے گوشت، چاول، سبزی، دال، پھل وغیرہ سے مراد ہوتی ہے۔

اُردو میں کسی لفظ کا مہمل بنانے کے لیے زیادہ تر واؤ کا استعمال رائج ہے۔دیگر زبانوں جیسے پشتو اور ہندی میں علی الترتیب 'ش' اور 'م' وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ فارسی اور عربی زبان میں مہمل کے استعمال کی کوئی روایت نہیں ملتی۔اس دل چسپ اصطلاح کا استعمال صرف دیسی یا انڈو آرین زبانوں میں ہی کیا جاتا ہے۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کی نصف دہائی میں ہندو پاک واُردو کی دیگر نئی بستیوں میں غزل گوئی کے فن میں

مزید نکھار پیدا ہوا ہے تو صرف اس لیے کہ اس میں نئے نئے استعارات وئی نئی لفظیاتی اصطلاحات کا استعمال نہایت پُرکشش انداز میں کیا گیا ہے۔اس ضمن میں ’’تابع مہمل کی اصطلاح‘‘ کے استعمال کی روایت کا آغاز جدید غزل کے نمائندہ شاعر زیبؔ غوری (۱۹۸۵۔۱۹۲۸) نے کیا۔وہ اُردو شاعری کے افق پر فنی وفکری بصیرت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔غالبؔ کی طرح وہ بھی اختراعی ذہن کے مالک تھے۔کچھ نیا کرنے کا جذبہ ان کی شخصیت میں بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا تھا۔اسی لیے ان کے کلام میں غالبؔ کے اسلوب کی چمک دمک ،آب وتاب، زیرک نگاہی ودوراندیشی ،مفکرانہ ودانشورانہ اندازِ فکر کے گہرے اثرات کی جھلک ملتی ہے۔ان کے یہاں ماضی کی صدائے باز گشت بھی ہے اورعصری مسائل وموضوعات سے کشید کیا گیا عرفان بھی۔ان کا اسلوب جدیدیت کا نمایاں اور منفرد اسلوب ہے۔انہوں نے غزل میں نیا طرز ایجاد کیا جوان کے ہم عصروں میں کمیاب ہے۔ان کی شاعری تازہ کاری کی عمدہ مثال ہے۔انہیں خود پر حد درجہ اعتماد تھا۔وہ کہتے ہیں:

موضوعِ سخن ہمّتِ عالی ہی رہے گی
جو طرز نکالوں گا مثالی ہی رہے گی

انہوں نے اپنے اس مسلک کی نمائندگی کے لئے عمر کی آخری منزل میں ۱۹۷۷ء میں ’’تابع مہمل کی اصطلاح‘‘ کا استعمال کرتے ہوئے ایک خوبصورت اور دل آویز غزل قلم بند کی تھی جوان کے مجموعہ کلام ’’چاک‘‘ (۱۹۸۵) میں صفحہ نمبر ۵۲۔۵۳ پر درج ہے۔تبدیلی اور تغیر کے امکانات کبھی بھی معدوم نہیں ہوتے ہیں۔واقعات اور حالات کے ساتھ انسان کے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔سچائی اور حقیقت یکے بعد دیگرے ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔زندگی کی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ان سے صرفِ نظر کرنا آسان نہیں

مہمل لفظ بنانے اور اس کے استعمال کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ بیان میں مزید زور پیدا کیا جائے اور معنویت میں اضافہ کیا جائے۔لفظ اور مہمل کے باہمی اشتراک سے کئی لفظوں کی پردہ داری بھی ہوتی ہے اور دیکھا جائے تو ایک طرح سے مختلف وضاحت طلب الفاظ ذہن کے پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہو کر معنی ومطالب کے کئی جہان بھی آباد کرتے ہیں۔مثلاً جب میزبان اپنے مہمان سے دریافت کرتا ہے کہ پانی وانی پیا یا روٹی ووٹی کھائی کہ نہیں تو اس کے پسِ پردہ دسترخوان پر موجود پانی کے دیگر لوازمات جیسے لڈّو، برفی اور رس گلّہ وغیرہ اور روٹی کے متعلقات جیسے گوشت، چاول، سبزی، دال، پھل وغیرہ سے مراد ہوتی ہے۔

اُردو میں کسی لفظ کا مہمل بنانے کے لیے زیادہ تر واؤ کا استعمال رائج ہے۔دیگر زبانوں جیسے پشتو اور ہندی میں علی الترتیب ’ش‘ اور ’م‘ وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ فارسی اور عربی زبان میں مہمل کے استعمال کی کوئی روایت نہیں ملتی۔اس دل چسپ اصطلاح کا استعمال صرف دیسی یا انڈو آرین زبانوں میں ہی کیا جاتا ہے۔

ہوتا ہے۔اسی لیے کسی بھی فن میں تبدیلی ہر لمحہ اور ہر پل ناگزیر ہوتی ہے۔شرط یہ ہے کہ فنکار کی آنکھیں کھلی ہوں اور اس وسیع کائنات میں ہونے والی تبدیلیو ں پر اس کی گہری نگاہ ہو۔زیبؔ غوری ان صفات سے متصف تھے۔اسی لیے انہوں نے اُردو غزل میں ایک نئی روایت یعنی تابع مہمل کی اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔وہ غزل درج ذیل ہے۔

مجھ ایسے داماندۂ جاں کو بستر وستر کیا
پل دو پل کو موندلوں آنکھیں ورنہ گھر ور کیا
چھوڑو کیا رونا لے بیٹھے رنج وراحت کا
قید ہی جب ٹھہری ہستی تو بہتر وہتر کیا
میں بھی سر ٹکراتا پھرا ہوں دیواروں سے بہت
ڈھونڈ رہے ہو اس گنبد میں کوئی در ور کیا
آخر کو تھک ہار کے مجھ کو زمیں پر آنا ہے
زور و شورِ بازو کیسا شہپر وہپر کیا
میرے قلم ہی سے جب میرا رزق اُترتا ہے
جانا ہے اک کارِ زیاں کو دفتر وفتر کیا
صورت ایک تراشوں گا تو سو رہ جائیں گی
کیوں پتھر کو سبک کروں میں پیکر ویکر کیا
بالیدہ بار آور ہونا، مٹّی ہو جانا
سرسبزی زرخیزی کیسی، بنجر ونجر کیا
آب وسراب وخواب وحقیقت ایک سے لگتے ہیں
دیدہ وری کیا، آئینہ کا جوہر ووہر کیا
مجھ کو بہائے لے جاتی ہے خود ہی موج مری
میرا رستہ روک سکیں گے پتھر وتھر کیا
رنگِ شفق، سبزے کا نشہ کچھ نہیں آنکھوں میں
دور خلا میں دیکھ رہا ہوں منظر ونظر کیا
میرا اور ساحل کا رشتہ کب کا ٹوٹ چکا
زیبؔ کہاں کا خیمۂ کشتی لنگر ونگر کیا

بعد میں انہوں نے اس غزل میں تابع مہمل الفاظ کی فہرست میں مزید خوبصورت اضافے کیے ہیں یا یوں کہا جائے کہ اسی زمین اور پرانے ردیف وقافیہ میں ایک نئی غزل کہی جوان کے دوسرے مجموعۂ کلام ’چاک‘ میں شامل نہیں ہے۔

مالا والا، بندی وندی جھومر وومر کیا
زیور تیرا چہرہ تجھ کو، زیور ویور کیا
کام زباں سے ہی لیتے ہیں سارے مہذب لوگ
طنز کا اک نشتر کافی ہے پتھر وتھر کیا
اوّل تو ہم پیتے نہیں ہیں گر پینا ٹھہرے
تیری آنکھوں سے ہی پی لیں گے ساغر واغر کیا
جیون اک چڑھتا دریا ہے ڈوب کے کرلے پار
اس دریامیں کشتی وشتی، لنگر ونگر کیا
مال وال کس شمار میں ہے جان وان ہے کیا
سر میں سودا سچ کا سماجائے تو سرور کیا
تجھ کو دیکھا جی بھر کے اور آنکھیں ٹھنڈی کرلیں
گل ول کیا ہے اور منظر و نظر کیا
زیبؔ کہو اللہ کرے فردوس بریں ہو میرا امکاں
شعر ویر یہ غزل وزل کیا مضطر وضطر کیا

یہ اضافہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اگر زندگی نے انھیں کچھ اور مہلت دی ہوتی تو اس روایت کو مزید استحکام حاصل ہوتا۔ جیسا کہ رباعی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل فن ہے اور اس کے لیے اک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے۔ زیب غوری نے بھی طویل فنی ریاضت کے بعد تابع مہمل کی اصطلاح کے استعمال کی روایت کا آغاز کیا۔

یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ایک صدی ختم ہوتی ہے اور دوسری کا آغاز ہوتا ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس طرح روشنی کا سلسلہ بدستور قائم رہتا ہے۔ بیسویں صدی میں زیب غوری نے جس روایت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس میں اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مشہور ومعروف اور ہر دل عزیز شاعر راحت اندوری(۱۹۵۰-۲۰۲۰) نے برگ وبار لانے اور کم وبیش اسی رنگ کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری میں رومان کی خوشبو بھی ہے اور زندگی کی المناکیوں پر گفتگو بھی۔ دردوغم کے قصّے بھی ہیں اور ٹھوس حقیقتوں کی چاک دامانی بھی۔ سیاست کی بے راہ روی کا مرثیہ بھی ہے اور ماضی کی اعلا اقدار کی

یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ایک صدی ختم ہوتی ہے اور دوسری کا آغاز ہوتا ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس طرح روشنی کا سلسلہ بدستور قائم رہتا ہے۔ بیسویں صدی میں زیب غوری نے جس روایت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس میں اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مشہور ومعروف اور ہر دل عزیز شاعر راحت اندوری نے برگ وبار لانے اور کم وبیش اسی رنگ کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری میں رومان کی خوشبو بھی ہے اور زندگی کی المناکیوں پر گفتگو بھی۔ دردوغم کے قصّے بھی ہیں اور ٹھوس حقیقتوں کی چاک دامانی بھی۔ سیاست کی بے راہ روی کا مرثیہ بھی ہے اور ماضی کی اعلا اقدار کی بازیافت کا جذبہ بھی۔ بلند حوصلگی بھی ہے اور بغاوت کی آواز بھی۔ پُرامن معاشرے کے قیام کا پیغام بھی ہے مشترکہ تہذیبی وراثت کی چاہت بھی۔ ظلم وبربریت ،ہوس پرستی و اقربا پروری کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے اور اقتدار کے نشے میں چور عصری سیاست کا تازیانہ وانقلاب کی آہٹ کا اعلان بھی۔ ان کا ذہن بھی اختراعیت سے متصف تھا۔

بازیافت کا جذبہ بھی۔ بلند حوصلگی بھی ہے اور بغاوت کی آواز بھی۔ پُرامن معاشرے کے قیام کا پیغام بھی ہے مشترکہ تہذیبی وراثت کی چاہت بھی۔ ظلم وبربریت ،ہوس پرستی و اقربا پروری کے خلاف صدائے احتجاج بھی ہے اور اقتدار کے نشے میں چور عصری سیاست کا تازیانہ وانقلاب کی آہٹ کا اعلان بھی۔ ان کا ذہن بھی اختراعیت سے متصف تھا۔ انہوں نے بھی تابع مہمل کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہوئے ایک خوبصورت اور معنویت سے بھرپور غزل لکھی ہے جو ان کے مجموعۂ کلام ''کھیت سنہرے ہیں'' میں شامل ہے۔ وہ درج ذیل ہے۔

اس کی کتھئی آنکھوں میں ہیں جنتر منتر سب
چاقو واقو، چھریاں وریاں خنجر ونجر سب
جس دن سے تم روٹھیں مجھ سے روٹھے روٹھے ہیں
چادر وادر، تکیہ وکیہ، بستر و ستر سب
مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی کہاں اب پہلے جیسی ہے
پھیکے پڑ گئے کپڑے وپڑے، زیور ویور سب
آخر میں کس دن ڈوبوں گا، فکریں کرتے ہیں
دریا وریا، کشتی وشتی، لنگر و نگر سب
تلسی نے جو لکھا اب کچھ بدلا بدلا ہے
راون واون، لنکا و نکا، بندر وندر سب
دکھ کے چمن کے باسی ہیں یہ دردِ شہر کے بانی ہیں
محسن وحسن، غالب والب، ساغر واغر سب
عشق وشق کے سارے نسخے ہم سے سیکھتے ہیں
طاہر واہر، جوہر ووہر، منظر ونظر سب

مذکورہ بالا غزلیں اردو ادب کے شعری سفر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک طرح سے زیبؔ غوری اور راحتؔ اندوری کی یہ غزلیں علی الترتیب بارش کے پہلے اور دوسرے قطرے کی مانند ہیں۔ اس بات کی قوی امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل کے قلم کار اس روایت کو مزید نکھار کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر بکھیریں گے۔

❑❑❑

عوامی اقدار و احساسات کے انقلابی شاعر: ڈاکٹر راحت اندوری

ڈاکٹر احمد علی جوہر

اسسٹنٹ پروفیسر (گیسٹ فیکلٹی)
شعبہ اردو، جے، این، کالج،
نہرا، دربھنگہ، بہار
رابطہ: 9968347899

ڈاکٹر راحت اندوری جری اور بے باک لب ولہجہ کے انقلاب آفریں شاعر ہیں۔ ان کے انقلابی نغموں کی گونج بازار، گلی کوچوں اور سڑکوں سے لے کر پارلیمنٹ تک، ہر مجلس اور محفل میں سنائی دی اور آج بھی دے رہی ہے۔ ان کا لہجہ تو انقلابی تھا ہی، اس کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں بھی ایسا انقلابی آہنگ ہے کہ ان کے کلام کو پڑھتے ہی قاری کے دل میں انقلابی جذبہ انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ ڈاکٹر راحت اندوری کے اسی انقلابی لب ولہجہ نے انہیں موجودہ ادبی وشعری منظرنامہ میں ایک الگ شناخت عطا کی۔

ڈاکٹر راحت اندوری کا اصل نام راحت اللہ قریشی تھا۔ وہ یکم جنوری 1950ء کو اندور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اندور کے اسکولوں میں حاصل کی۔ برکت اللہ یونیورسٹی سے انہوں نے 1973ء میں ایم-اے اردو کی ڈگری حاصل کی اور 1975ء میں اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی انہیں شعروشاعری کا شوق تھا۔ اسی شوق نے انہیں اردو کا ایک بے باک اور انقلابی شاعر بنا دیا۔ ڈاکٹر راحت اندوری نے درس وتدریس کا پیشہ بھی اختیار کیا مگر پھر انہوں نے درس وتدریس کو خیرباد کہہ کر شعروشاعری اور مشاعروں کے لئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔ انہوں نے تقریباً پچاس برسوں تک شاعری کی۔ اپنے پچاس سالہ شعری سفر میں ڈاکٹر راحت اندوری نے حمد، نعت، قطعات لکھے، متعدد فلمی گانے تحریر کئے، کئی کتابوں کی تصنیف کا فریضہ انجام دیا، لیکن ان سب کے باوجود ان کی اصل شناخت ایک غزل گو شاعر کی ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جیسے دھوپ، میرے بعد، پانچواں درویش، رت بدل گئی، ناراض، موجود۔

ڈاکٹر راحت اندوری کی غزلیں ادبی اعتبار سے کس مقام ومرتبہ کی حامل ہیں، یہ تو آنے والا وقت بتائے گا، لیکن یہ بات سچ ہے کہ وہ اپنے عہد میں اردو مشاعروں کے سب سے مقبول ترین شاعر تھے۔ انہوں نے اردو مشاعروں کے توسط سے ملک کے اطراف واکناف اور بیرون ملک امریکہ، افریقہ، خلیجی ممالک اور یورپ میں اردو شاعری کا پرچم بلند کیا۔

اردو مشاعروں کے ذریعہ بیرونی ممالک میں اردو کی نئی بستیاں قائم کرنے اور اردو زبان کی سرحدوں کی توسیع میں بھی ان کا اہم کردار رہا ہے۔ ڈاکٹر راحت اندوری کے پڑھنے کا انداز بہت نرالا تھا۔ بار بار دہرا دہرا کر شعر پڑھنا اور سامعین کو لطف سے سرشار کرنا ان کا خاص وصف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو مشاعروں میں ان کی شاعری کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا اور وہ اردو مشاعروں کے بے تاج بادشاہ تسلیم کئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر راحت اندوری نے عصر حاضر میں اردو مشاعروں کو جو زیب و زینت بخشی اور وقار و استحکام عطا کیا، اس میں ان کے ہم عصر شعراء میں کوئی ان کا مدمقابل نظر نہیں آتا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر اور شروع اکیسویں صدی کے اردو مشاعروں کی جو بھی تاریخ مرتب کی جائے گی، وہ شاعر ڈاکٹر راحت اندوری کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔

ڈاکٹر راحت اندوری کو بہ حیثیت شاعر یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اردو اور ہندی دونوں حلقوں میں اور اپنے ملک کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ ان کی مقبولیت وشہرت آسمان کی بلندیوں کو پہنچی ہوئی ہے۔ ان کی غیر معمولی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں۔ مشہور ناقد پروفیسر شارب ردولوی فرماتے ہیں:

> ''راحت اندوری نے اردو شاعری کو ایک نئی زبان دی۔ انھوں نے شاعری کو اپنے قارئین اور سامعین سے مکالمہ بنادیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری بازار سے پارلیمنٹ تک ہر جگہ مقبول ہوئی اور لوگ آج بھی ان کے اشعار ہر موقع پر پڑھتے ہیں۔''

ان کے عوام میں مقبول و ہردلعزیز ہونے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ عوام کو ان کی شاعری میں اپنے خوابوں کی تعبیر اور اپنا مستقبل نظر آتا تھا۔ دراصل ڈاکٹر راحت اندوری کی شاعری کا خمیر عام انسانی زندگی سے تیار ہوا ہے۔ ان کی شاعری عوامی اقدار و روایات میں گتھی ہوئی شاعری ہے۔ ڈاکٹر راحت اندوری نے اپنی شاعری میں سماج کے ان سلگتے چیختے مسائل کو جگہ دی جس کا اظہار عوام براہ راست نہیں کر پارہے تھے۔ انھوں نے عام انسانی دکھوں، پیچیدگیوں اور جذبات واحساسات کو اتنی نزاکت سے بیان کیا کہ ہر آدمی کو ان کی شاعری میں اپنے دل کی بات نظر آنے لگی۔ ڈاکٹر راحت اندوری نے عام انسانوں کی عام فہم اور سادہ زبان میں ان کی بات اس طرح کی کہ ان کی شاعری 'میں نے یہ مانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے' کے مصداق ہوتی گئی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عام انسانوں کے جذبات و احساسات اور عوامی اقدار و روایات کی موثر عکاسی کی۔ ان کی شاعری انسانی اقدار کے تحفظ کی ضامن اور عوام کے جذبات واحساسات کی ترجمان ہے جو ہمیں سماجی مسائل کا ادراک سکھاتی ہے۔ ڈاکٹر راحت اندوری نے اردو مشاعروں کے اسٹیج سے عوام کے حقوق کے لئے جس پرزور انداز میں صدا بلند کی اور جس موثر انداز میں عوام کی نمائندگی وترجمانی کی، اس نے ان کی شاعری کو عوام کی ایسی طاقت بنادی جسے عوام کھونا نہیں چاہتے اور پوری طرح اس کا احترام کرتے ہوئے اسے ہردلعزیز رکھتے ہیں۔

راحت اندوری نے اپنی شاعری کے ذریعہ سماج کو اس کی تلخ سچائیوں سے روبرو کروایا ہے اور عہد حاضر کی پیچیدہ زندگی کے سنگین مسائل کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں عصر حاضر کی زندگی کی بھرپور جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آج کی انسانی زندگی کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ رشتوں کی معنویت ختم ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے عام انسانی زندگی بے سہارا و بے بس نظر آتی ہے۔ غیر انسانی رویوں کی وجہ سے آبادیوں میں زندگی آباد ہونے کے بجائے، برباد ہوتی جارہی ہے۔ ہر جگہ اصل اور مستحق لوگوں کا استحصال ہورہا ہے اور نقلی لوگ ہیرو بنتے جارہے ہیں۔ انسانی معاشرے میں بربریت و بہیمیت عام ہوگئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انسانی آبادی میں درندے آکر بس گئے ہیں۔ راحت نے اپنے طنزیہ انداز میں ان تمام پہلوؤں کی تصویر کشی اس طرح کی ہے۔

رشتوں کی دھوپ چھاؤں سے آزاد ہوگئے
اب تو ہمیں بھی سارے سبق یاد ہوگئے

آبادیوں میں ہوتے ہیں برباد کتنے لوگ
ہم دیکھنے گئے تھے تو برباد ہوگئے

میں پربتوں سے لڑتا رہا اور چند لوگ
گیلی زمین کھود کر فرہاد ہوگئے

بیٹھے ہوئے ہیں قیمتی صوفوں پہ بھیڑیے
جنگل کے لوگ شہر میں آباد ہوگئے

آج کے عہد میں دوستی کی بنیاد خود غرضی و مصلحت پسندی پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب دوستی میں ایک وقت ایسا موڑ آتا ہے کہ وہ دشمنی سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ اسی لئے اب لوگ دوستی کرنے سے گریز کرنے لگے ہیں یا پھر بہت چھان پھٹک کر دوستی کرتے ہیں۔ آج انسانی آبادی کی فضا ماحولیاتی اور سماجی

دونوں اعتبار سے اتنی آلودہ اور زہریلی ہوگئی ہے کہ ہر آدمی کی زبان پر یہ شکوہ ہے کہ اب کیسے اور کہاں سانس لی جائے اور ایسے حالات میں زندگی کی ندی کیسے پار کی جائے۔

دوستی جب کسی سے کی جائے
دشمنوں کی بھی رائے لی جائے
موت کا زہر ہے فضاؤں میں
اب کہاں جاکے سانس لی جائے
بس اسی سوچ میں ہوں ڈوبا ہوا
یہ ندی کیسے پار کی جائے

ہمارے معاشرے میں آج خلوص و محبت اور وفاداری کے جذبات کا فقدان ہے۔ ریا کاری اور دکھاوا عام بات ہے۔ اب شناسائی لوگ ہمارے زخموں کا مداوا کرنے کے بجائے، مزید کاری زخم لگاتے ہیں۔ اس لئے اب ان سے ملتے ہوئے ڈر لگنے لگا ہے۔ لوگ بظاہر تو ساتھ ساتھ ہیں لیکن حقیقت میں کوسوں دور ہیں۔ انسان کی سنگدلی کا یہ عالم ہے کہ بھائی اپنے سگے بھائی سے عید میں گلے نہیں ملتے۔ دیکھئے شاعر ڈاکٹر راحت اندوری نے اپنے بے باک طنزیہ لہجہ میں ان پہلوؤں کی مصوری کرتے ہوئے موجودہ خودغرض اور سنگدل معاشرہ کو کس طرح بے نقاب کیا ہے۔

مرے خلوص کی گہرائی سینہیں ملتے
یہ جھوٹے لوگ ہیں سچائی سے نہیں ملتے
پرانے زخم ہیں کافی، شمار کرنے کو
سو اب کسی بھی شناشائی سے نہیں ملتے
ہیں ساتھ ساتھ مگر فرق ہے مزاجوں کا
مرے قدم مری پرچھائی سے نہیں ملتے
محبتوں کا سبق دے رہے ہیں دنیا کو
جو عید اپنے سگے بھائی سے نہیں ملتے

ہمارے معاشرے میں اب سچائی کی کوئی قدر نہیں ہے جہاں دیکھئے جھوٹ کا بول بالا ہے۔ جھوٹ نے بڑی تیزی سے نہ صرف ترقی کی ہے بلکہ یہ اتنا طاقتور ہوگیا ہے کہ ہر آدمی اس کا قدم چومنے پر مجبور ہے اور سچائی کی سزا اتنی بھیانک ہے کہ اب آدمی کو سچ بولنے سے ڈر لگنے لگا ہے۔ دیکھئے شاعر ڈاکٹر راحت اندوری نے اس تلخ سچائی کو اپنے طنزیہ انداز میں کس طرح اجاگر کیا ہے۔

ہم بھی اب جھوٹ کی پیشانی کو بوسہ دیں گے
تم بھی سچ بولنے والوں کو سزا دیتے تھے
سچ بات کون ہے جو سرعام کہہ سکے
میں کہہ رہا ہوں مجھ کو سزا دینی چاہئے

آج پوری دنیا میں بے روزگاری و بیکاری ایک سنگین مسئلہ ہے۔ خصوصا اپنے ملک ہندوستان کے تناظر میں یہ مسئلہ ایک ناسور کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے جہاں کروڑوں نوجوان کالج اور یونیورسٹی سے پڑھنے کے بعد بے روزگاری کا درد جھیل رہے ہیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہے۔ ڈاکٹر راحت اندوری نے اس صورت حال پر بلیغ طنز کرتے ہوئے اس کی تصویرکشی اس طرح کی ہے۔

کالج کے سب بچے چپ ہیں کاغذ کی اک ناؤ لیے
چاروں طرف دریا کی صورت پھیلی ہوئی بیکاری ہے

یہ کتنا دردناک پہلو ہے کہ مائیں محنت و مشقت سے اپنے بیٹوں کی پرورش کرتی ہیں مگر یہ بیٹے ان کی ضعیفی کا سہارا بننے کے بجائے اپنے آپ کو شہر کی رنگ رلیوں کے حوالے کردیتے ہیں اور ان کی ضعیف مائیں اکیلی و بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر راحت اندوری نے اس دردناک صورت حال کو اس طرح بیان کیا ہے۔

نوجواں بیٹوں کو شہروں کے تماشے لے اڑے
گاؤں کی جھولی میں کچھ مجبور مائیں رہ گئیں

یہ بات تو سچ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بے ضمیری عام ہے۔ خودغرضی، مفاد پرستی اور تملق و چاپلوسی کا بڑا غلبہ ہے، لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو ہمارے سماج میں کم تعداد میں ہی سہی ایسے قلندر صفت اور باضمیر و خوددار افراد موجود ہیں جن کی درویشی، باضمیری و خودداری کے سامنے بڑی بڑی سلطنتیں ہیچ ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے وجود سے آج بھی ہمارے انسانی معاشرے اور دنیا کا حسن قائم ہے۔

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

ڈاکٹر راحت اندوری ایسے شاعر ہیں جن کے زاویۂ فکر میں اعلی انسانی اقدار کا رنگ جلوہ گر ہے۔ انہیں انسانی اقدار کے کھوجانے کا بے حد رنج و ملال ہے۔ وہ اس کی بازیافت کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں اور آلام و مصائب بھی برداشت کرنے کو تیار دکھائی دیتے ہیں۔

مری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اٹھے
مرے بھائی مرے حصے کی زمیں تو رکھ لے
ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گذرے ہوں گے
کم سے کم راہ کا پتھر تو ہٹاتے جاتے

راحت اندوری کی شاعری کا ایک خاص موضوع سیاست ہے۔ آج مقامی سیاست سے لے کر عالمی سیاست تک میں نہ جانے کتنے منفی عناصر درآئے ہیں۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا موقع پرست سیاست کا عام شیوہ ہے۔ سیاست میں نئے نئے کرداروں کی آمد ہورہی ہے مگر جھوٹ اور مکروفریب کا وہی برسوں قدیم گھناؤنا

کاروبار چل رہا ہے۔ رہزن، رہبر بن گئے ہیں۔سیاست کی دکان چلانے کے لئے نہ جانے کیسی کیسی سازشوں کا سہارا لیا جاتا ہے اور افواہوں کا راگ الاپا جاتا ہے۔ دیکھئے شاعر ڈاکٹر راحت اندوری نے اپنے طنزیہ ومزاحیہ انداز میں آج کی عصری سیاست کو بے نقاب کرتے ہوئے اس پر کیسا تیکھا طنز کیا ہے:

نئے کردار آتے جارہے ہیں
مگر ناٹک پرانا چل رہا ہے
دیکھئے جس کو اسے دھن ہے مسیحائی کی
آج کل شہروں کے بیمار مطب کرتے ہیں

ڈاکٹر راحت اندوری نے سیاسی شاعری کرتے ہوئے بعض سامنے کے موضوعات پر ایسے اچھوتے اشعار کہے ہیں جو عوام کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ان کے اس قسم کے اشعار لوگوں کے دلوں اور زبانوں پر زندہ ہیں۔ایسے ہی اشعار میں ان کا ایک بہت ہی معروف شعر ہے۔

سرحدوں پر بہت تناؤ ہے کیا؟
کچھ پتہ تو کرو چناؤ ہے کیا؟

راحت اندوری اپنے عہد کے بے باک، نڈر اور جری لب ولہجہ کے منفرد انقلابی شاعر ہیں۔انجام کی پروا کئے بغیر بے باکی سے اپنے عہد کے مسائل کو اٹھانا اور دوٹوک انداز میں شاعری کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔وہ جبر و استحصال کے خلاف اور عدل وانصاف کے حامی ہیں۔ دکھی انسانیت کے لئے مرہم الفاظ مہیا کرنا،مظلوموں کے لئے ظالموں سے پنجہ آزمائی کی جرأت دلانا،خوشگوار مستقبل کی نوید سنانا اور جیتی جاگتی محبتوں اور الفتوں کی نغمہ خوانی کرنا ان کے شاعری کے مخصوص اوصاف ہیں۔وہ عوام کو انسانی قوتوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور تخلیقی کاوشوں کو انسانی ہمدردی اور عوامی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردیا۔ڈاکٹر راحت اندوری نے اپنی شاعری سے عوام کے جمہوری، سماجی اور سیاسی حقوق کی پاسداری کے لئے صدا بلند کی اور استحصالی قوتوں کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ انہوں نے موقع پرست سیاست دانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح للکارا کہ ایوان سیاست میں لرزہ طاری ہوگیا۔دیکھئے ڈاکٹر راحت اندوری کے اس نوع کے اشعار میں کس قدر طنز کی کاٹ، مزاحمت کا عنصر اور کتنا شدید رزمیہ آہنگ اور احتجاجی رنگ نمایاں ہے۔

لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے
جو آج صاحب مسند ہیں،کل نہیں ہوں گے
کرائے دار ہیں،کوئی ذاتی مکان تھوڑی ہے
سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

ڈاکٹر راحت عوامی انقلاب کے شاعر ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کے حقوق کے لئے بھرپور جدوجہد کی اور مظلوموں اور بیکسوں کی آواز کو اٹھا کر سماج میں تبدیلی لانے کی کوشش کی تاکہ ان کو ان کا حق ملے،لیکن جب سماج میں کسی طرح کی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی اور انسانیت پر ظلم واستبداد کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا تو ان کے دردمند دل نے مضطرب و بے چین ہوکر اپنے اشعار کے ذریعہ ظالمانہ وغاصبانہ قوتوں پر اس طرح کاری ضرب لگائی۔

دوگز سہی مگر یہ مری ملکیت تو ہے
اے موت تو نے مجھ کو زمیندار کردیا

یہ شعر بظاہر تو بہت سادہ سا معلوم ہوتا ہے مگر یہ شعر سامراجیت کیمنہ پر زوردار طمانچہ ہے۔آج پوری دنیا میں سامراجی نظام کس طرح سے مزدوروں ومحنت کشوں کا لہو پیتا ہے، اس شعر میں اس کی بھرپور ترجمانی موجود ہے۔

انقلابی شاعر کے یہاں زندگی اور موت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔زندگی کی طرح موت بھی عزیز شئے ہوتی ہے اور عوام کو بھی اسی کی ترغیب وتلقین کی جاتی ہے۔شاعر ڈاکٹر راحت اندوری کے یہاں بھی یہ انقلابی رویہ موجود ہے۔

ایک ہی ندی کے ہیں یہ دو کنارے دوستو
دوستانہ زندگی سے موت سے یاری رکھو
یہ سانحہ تو کسی دن گزرنے والا تھا
میں بچ بھی جاتا تو اک روز مرنے والا تھا

راحت صاحب اپنے انقلابی نظریہ کے پیش نظر سماج اور عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں،لیکن سماج اور عوام میں اس قدر بے حسی و بزدلی ہے کہ وہ کسی طرح بیدار نہیں ہوتے۔ایسے میں شاعر ڈاکٹر راحت اندوری بزدل اور بے حس سماج پر طنز کا تیکھا وار کرتے ہوئے شکوہ سنج نظر آتے ہیں:

ہے میرے چاروں طرف بھیڑ گونگے بہروں کی
کسے خطیب بناؤں کسے خطاب کروں
لوگ ہر موڑ پہ رک رک کے سنبھلتے کیوں ہیں
اتنا ڈرتے ہیں تو پھر گھر سے نکلتے کیوں ہیں

راحت اندوری شکوہ ضرور کرتے ہیں مگر وہ اپنے عوام اور سماج سے مایوس نہیں ہیں۔کیوں کہ انقلابی شاعر کے یہاں یاس وقنوطیت کے

بجائے رجائیت کے عنصر کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر راحت اندوری بھی رجائیت کے حامل انقلابی شاعر ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ عوام میں جوش وجذبہ پیدا کرنے اور انہیں ہمت وحوصلہ بخشنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ عوام کو صعوبتوں میں زندگی کے برتنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ عوام میں اس طاقت کو پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے انقلابی جذبہ کی چنگاری بجھنے نہ پائے اور مناسب موقع پر وہ چنگاری، انقلاب کی صورت لے سکے۔ ڈاکٹر راحت اندوری کے جوش وجذبہ سے پر اس طرح کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

شاخوں سے ٹوٹ جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا

آنکھ میں پانی رکھو ہونٹوں پہ چنگاری رکھو
زندہ رہنا ہے تو ترکیبیں بہت ساری رکھو

راحت اندوری کے انقلابی جذبہ میں حب وطن کا پہلو نمایاں ہے۔ انہیں ملک کے ذرے ذرے سے بے پناہ عقیدت و محبت ہے۔ اپنے ملک ہندوستان کی آن بان شان پر وہ ذرہ برابر بھی آنچ آنے کے قائل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر راحت اندوری نے اپنے ملک ہندوستان کو آنکھ دکھانے والی طاقتوں کو اس پرزور انداز میں چیلینج کیا اور للکارا ہے کہ ان کے اشعار کو پڑھ کر قاری کے اندر انقلاب کا جذبہ انگڑائی لینے لگتا ہے اور وہ اپنے وطن پر مرمٹنے کے لئے تیار دکھائی دیتا ہے۔ دیکھئے ڈاکٹر راحت اندوری نے اس موقع سے رزمیہ آہنگ سے معمور کس طرح کے انقلابی اشعار کہے ہیں:

راہ میں خطرے بھی ہیں لیکن ٹھہرتا کون ہے
موت کل آتی ہے، آج آجاؤ ڈرتا کون ہے

تیرے لشکر کے مقابل میں اکیلا ہوں مگر
فیصلہ میدان میں ہوگا کہ مرتا کون ہے

راحت سیکولر اقدار پر یقین رکھنے والے روشن خیال اور وسیع النظر شاعر ہیں۔ وہ اردو تہذیب وثقافت کے سچے ترجمان، اردو کی قدیم روایتوں کے امین اور مشترکہ تہذیبی وراثت کے علم بردار ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری سے ہمیشہ جمہوریت اور سیکولرزم کے تحفظ کا درس دیا۔ ڈاکٹر راحت اندوری گنگا جمنی تہذیب کے عاشق وشیدائی ہیں اور ہمیشہ اس کی بقا وتحفظ کے لئے کوشاں رہے۔ یہی گنگا جمنی تہذیب، ملک ہندوستان کی روح اور یہاں کی مٹی کی خوشبو ہے جو ڈاکٹر راحت اندوری کی شاعری میں پوری طرح موجود ہے۔ ان کی شاعری میں ملک ہندوستان کی مٹی سے عقیدت ومحبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں پورا ہندوستان بولتا ہوا اور جیتا جاگتا نظر آتا ہے:

ہم اپنی جان کے دشمن کو اپنی جان کہتے ہیں
محبت کی اسی مٹی کو ہندوستان کہتے ہیں

میں جب مرجاؤں تو میری الگ پہچان لکھ دینا
لہو سے میری پیشانی پہ ہندوستان لکھ دینا

راحت اندوری نے رومانی اور عشقیہ شاعری بھی کی ہے مگر ان کی شاعری صرف حسن وعشق کے تنگ دائروں میں محصور یا خوابوں کی دنیا تک محدود نہیں ہے، بلکہ مسائل زیست کی ترجمان ہے۔ ڈاکٹر راحت اندوری نے بہت جلد دل کی دنیا سے نکل کر اپنی شاعری کا رخ سماجی مسائل کی طرف پھیر دیا۔ انہوں نے سماج میں ظلم کرنے والی قوتوں کو پہچانا اور مظلوموں کے مسائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ ان کی شاعری میں سماج میں جینے والے ان مظلوموں کے دکھ درد اور آنسوؤں کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے جن کی طرف عموماً نگاہ نہیں جاتی۔ ایسے بے بس وبے سہارا مظلوم انسانوں کے دکھ درد کو محسوس کرکے ڈاکٹر راحت اندوری نے انہیں جینے کا حوصلہ بخشا۔ انہوں نے اپنی شاعری کو سماج کے ایسے دبے کچلے مجبور ومظلوم عوام کی آواز بنادی جن کی آواز کو سننے والا کوئی نہیں۔ آزادیٔ فکر، آزادیٔ اظہار، احترام آدمیت اور انسانی اقدار کی پاسداری، ان کی شاعری کے ایسے عناصر ہیں جو ان کی شاعری کو اپنے عہد کی توانا آواز بناتے ہیں۔

راحت اندوری کی شاعری کی بنت میں عوام کا درد وکسک اور آج کی انسانی زندگی کی آہ وکراہ شامل ہے۔ ان کی شاعری میں عوام کا مجروح ومخدوش چہرہ صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ بے باکی سے عوامی مسائل کو اٹھانا، عوامی اقدار و احساسات کی انقلابی ترجمانی کرنا اور شاعری کو عوام کی آواز بنا دینا، یہ سب ڈاکٹر راحت اندوری کی شاعری کی ایسی خصوصیات ہیں جو ان کی شاعری کی خوبصورتی بھی ہیں اور طاقت بھی۔ باغیانہ تیور، تیکھا طنزیہ ومزاحیہ انداز بیان، جرأت مندانہ لب ولہجہ، بے باکی وبے خوفی، مزاحمت کا عنصر اور احتجاجی رنگ، یہ سب ان کی شاعری کے وہ اوصاف ہیں جو موجودہ ادبی وشعری منظرنامہ میں انہیں ایک منفرد اور بے باک انقلابی شاعر کی حیثیت سے سامنے لاتے ہیں۔

□□□

ڈاکٹر راحت اندوری اپنے کلام کی روشنی میں

سیفی سرونجی

سیفی لائبریری

سرونج

ایم پی

رابطہ: 9340710963

ڈاکٹر راحت اندوری ہندوستان کے ان شعراء میں سے ایک ہیں، جنھوں نے پوری دنیا میں مشاعروں کے حوالے سے غزل کو روشناس کرایا ہے اور اپنے منفرد لہجے، منفرد اسٹائل سے غزل کی اہمیت وافادیت کا احساس دلایا ہے، جس طرح اردو زبان کی اہمیت اور مقبولیت کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے بیرونی ممالک میں مقبولیت سے ہم کنار کیا ہے، اسی طرح ڈاکٹر راحت اندوری نے اپنی منفرد غزل سے اردو شاعری کا چراغ روشن کیا ہے اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ جس اسٹیج سے مترنم شاعروں اور شاعرات نے غیر معیاری شاعری سنا سنا کر ماحول خراب کیا ہے، اسی اسٹیج سے راحت اندوری نے اپنی معیاری شاعری سے سامعین کے مزاج کو بدلا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرونی ممالک میں پروفیسر وسیم بریلوی، منور رانا اور ڈاکٹر راحت اندوری جیسے شاعر نہ ہوتے تو مشاعروں نے اردو شاعری کا بیڑا غرق کر دیا ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ مشاعروں نے اردو کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے، آج جگہ جگہ سعودی عرب، امریکہ، لندن اور دیگر ممالک میں جو اردو کا ماحول قائم ہوا ہے، وہ مشاعروں ہی کی دین ہے لیکن جس طرح کی شاعری مشاعروں کے ذریعہ عوام تک پہنچ رہی ہے، وہ زبان کے فروغ کا تو وسیلہ بن سکتی ہے، ادب کا نہیں، لیکن راحت اندوری نے اپنی شاعری سے اردو غزل کو ایک نئے آہنگ سے آشنا کرایا ہے، غزل میں نئے نئے الفاظ کے ذریعے اردو زبان میں اضافہ کیا ہے، روزمرہ اور عام بول چال کے الفاظ کا خوبصورت استعمال کر کے راحت اندوری نے انھیں اردو کا بنا دیا ہے:

چوراہوں پر وردی والے آپہنچے
موسم پھر تہواروں کا ہے مولیٰ خیر

بوڑھے ہوئے یہاں عیاش بمبئی
تو آج بھی جوان ہے عیاش بمبئی

دل بیٹھتے ہیں دوڑتے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ
سونے کی فصل بونی ہے قلاش بمبئی

انگلیاں یوں نہ سب پر اٹھایا کرو
خرچ کرنے سے پہلے کمایا کرو

زندگی کیا ہے خود ہی سمجھ جاؤ گے
بارشوں میں پتنگیں اڑایا کرو

اسی سے قرض چکائے ہیں میں نے صدیوں
یہ زندگی جو ہمیشہ ادھار رہتی ہے

ٹکٹکی باندھ لی ہے آنکھوں نے
راستے واپسی کے دیکھتے ہیں

سورج سے جنگ جیتنے نکلے تھے بے خوف
سارے سپاہی موم کے تھے گھل کے آ گئے

تو ناخنوں کے نہر سے نکالئے سونا
اگر کدال سے پتھر نکلنے لگتے ہیں

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ راحت اندوری نے ایسے ایسے بے شمار الفاظ جوکہ دوسروں کی نظر میں بے حقیقت اور غیر مانوس ہیں ، راحت اندوری نے انھیں الفاظ کو ایسے خوبصورت طریقے سے استعمال کیا کہ ہیرے موتی کی طرح جگمگانے لگے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ الفاظ یہیں کے لئے پیدا کئے گئے ہوں۔

خرچ کرنا، کمانا، پتنگیں، وردی، ترچھی، کدال، روٹی، رومال، کالر، بچھو، بے وقوف، سپاہی، ادھار، بوڑھے، شاباش، بمبئی، گھوڑوں، میدان جیسے سیکڑوں الفاظ راحت کے یہاں جگ مگا اٹھے اور یہی نہیں کہ ان کے استعمال سے کسی شعر میں شعریت نہ رہی ہو بلکہ ان میں تازگی پیدا کردی گئی ہے۔ راحت کا کمال یہ ہے کہ نئی نئی زمینوں، نئے نئے قوافی ردیفوں سے وہ

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ راحت اندوری نے ایسے ایسے بے شمار الفاظ جوکہ دوسروں کی نظر میں بے حقیقت اور غیر مانوس ہیں ، راحت اندوری نے انھیں الفاظ کو ایسے خوبصورت طریقے سے استعمال کیا کہ ہیرے موتی کی طرح جگمگانے لگے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ الفاظ یہیں کے لئے پیدا کئے گئے ہوں۔ خرچ کرنا، کمانا، پتنگیں، وردی، ترچھی، کدال، روٹی، رومال، کالر، بچھو، بے وقوف، سپاہی، ادھار، بوڑھے، شاباش، بمبئی، گھوڑوں، میدان جیسے سیکڑوں الفاظ راحت کے یہاں جگ مگا اٹھے اور یہی نہیں کہ ان کے استعمال سے کسی شعر میں شعریت نہ رہی ہو بلکہ ان میں تازگی پیدا کر دی گئی ہے۔ راحت کا کمال یہ ہے کہ نئی نئی زمینوں، نئے نئے قوافی ردیفوں سے وہ شعر کو بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں اور ان میں شعریت معنویت پیدا کر دیتے ہیں۔ حدتو یہ ہے کہ وہ روایتی لفظ بھی راحت اندوری کے یہاں زندہ جاوید ہوجاتے ہیں ، جو ہماری روایتی شاعری میں اتنے استعمال ہوئے ہیں کہ اپنی معنویت بھی کھو چکے ہیں جیسے وفا ، شراب، بے وفائی ، پیار محبت، خوشبو، روٹی، پیڑ، پتھر، قرض، دیپ وغیرہ

شعر کو بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں اور ان میں شعریت معنویت پیدا کر دیتے ہیں۔ حدتو یہ ہے کہ وہ روایتی لفظ بھی راحت اندوری کے یہاں زندہ جاوید ہوجاتے ہیں ، جو ہماری روایتی شاعری میں اتنے استعمال ہوئے ہیں کہ اپنی معنویت بھی کھو چکے ہیں جیسے وفا، شراب، بے وفائی، پیار محبت، خوشبو، روٹی، پیڑ، پتھر، قرض، دیپ وغیرہ لیکن راحت اندوری نے ان الفاظ کو بھی نئی معنویت سے ہمکنار کر دیا:

پہلے دیپ جلیں تو چرچے ہوتے تھے
اور اب شہر جلیں تو حیرت نہیں ہوتی

روٹی کی گولائی ناپا کرتا ہے
اسی لئے تو گھر میں برکت نہیں ہوتی

پرانے داؤں پر ہر دن آنسو لگاتا ہے
وہ اب بھی ایک پھٹے رومال پر خوشبو لگاتا ہے

نجانے یہ انوکھا فرق اس میں کس طرح آیا
وہ اب کالر میں پھولوں کی جگہ بچھو لگاتا ہے

وہ بے وفا یہاں سے بھی گذرا ہے بارہا
اس شہر کی حدوں میں وفا کیسے آئے گی

ہمیں اب عشق کا چالا پڑا ہے
بڑے منہ زور سے پالا پڑا ہے

اس طرح کے بے شمار شعر ڈاکٹر راحت اندوری کے یہاں موجود ہیں، سچ تو یہ ہے کہ راحت اندوری نے غزل کی مقبولیت میں ایسا اضافہ کیا ہے، جس کی مثال نہیں ملتی ’کلام‘ ان کا تازہ شعری مجموعہ ہے جسے کتاب دار پبلی کیشنز نے بہت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ فلیپ پر شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کی جامع رائے شامل ہے۔

❑❑❑

عصری حسیت کا نمائندہ شاعر: ڈاکٹر راحت اندوری

آصف پرویز

ریسرچ اسکالر
عالیہ یونیورسیٹی
کولکاتا
(مغربی بنگال)

عصر حاضر کے نمائندہ شعرا میں راحت اندوری اپنے منفرد لب ولہجہ اور مخصوص اندازِ بیان کے لیے پہچانے جاتے ہیں۔ فلمی دنیا سے ان کی وابستگی بھی ان کی شہرت کی وجہ بنی رہی۔ راحت اندوری کا عہد پر آشوب عہد تھا جہاں انہوں نے زندگی کو مختلف رنگوں میں پایا اور ان رنگوں کو اپنے فکر وفن کی آمیزش اور جذبات کی شمولیت سے عصری حسیت کا ترجمان بنایا۔

حالات کی نا آسودگی ہر دور میں شاعر وادیب کو متحرک اور متجسس بنا دیتی ہے اور اسے زمانہ سازی کی مصوری کا بیڑہ اٹھانا پڑتا ہے۔ پھر وہ کسی عہد ہی کا کیوں نہ ہو۔ آزادی کے بعد ہی سے ہندوستان کا سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی منظر نامہ بدل چکا تھا۔ ایسے میں شعرا کے رنگ شاعری اور ان کے مزاج میں تغیر وتبدل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ راحت صاحب کی آواز چونکا دینے والی آواز تھی جو صرف ماضی کا پژمردہ نہ تھی بلکہ حال اور مستقبل کا پیش خیمہ بھی تھی۔ راحت صاحب نے عصری مسائل پر بے باکی سے خامہ فرسائی کی۔ اور جو کچھ لکھا وہ ان کے شعور وادراک کا غماز تھا۔

راحت بیسویں صدی کے آخری ربع کے آغاز میں افق شاعری پر نمودار ہوئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چھا گئے۔ وہ کسی خاص نقطہ نظر کے حامل نہ تھے۔ نہ تو کسی تحریک اور نہ کسی رجحان کو پاؤں کی بیڑی بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بہت جلد ہی شہرت یافتہ شعرا کی صف میں جگہ مل گئی۔ راحت اندوری کی آواز انسانی اقدار کی شکست وریخت کی ایک ایسی آواز تھی جو نئے مسائل کو نئے سیاق وسباق کے ساتھ پیش کر رہی تھی۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

شاخوں سے ٹوٹ جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے

شہروں میں تو بارودوں کا موسم ہے
گاؤں چلو یہ امرودوں کا موسم ہے

بے باکی اور احتجاج ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ وہ بلاخوف طنز کے تیر برساتے ہیں انہیں نہ موت کا خوف تھا اور نہ سیاست کا۔ ''جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے'' کے مصداق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے رہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک شعر بہت مشہور ہوا۔

سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں
کسی کے باپ کا ہندوستان تھوڑی ہے

راحت کی شاعری کا کینوس نہایت وسیع ہے۔ ان کی شاعری دردمند دل کی آواز ہے۔ اگر ہم انہیں آج کے دور کا عوامی شاعر کہیں تو اس میں دروغ نہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔ براہ راست بیانیہ ان کی شاعری کا وصف خاص ہے۔ انہوں نے خاص و عام ہر کسی کو متاثر کیا۔ دلی جذبات واحساسات کو شعری سانچے میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ انکی آواز ہر کسی کے دل کی آواز بن جاتی ہے۔

میں تجھ کو روشنیاں دے کر جاؤں گا ایک دن
اندھیری رات سمجھ کر گزار دے مجھ کو
میں آج اپنے گھر سے نکلنے نہ پاؤں گا
بس اک قمیض تھی جو مرا بھائی لے گیا
میں اپنا عزم لے کر منزلوں کی سمت نکلا تھا
مشقت ہاتھ پہ لکھی تھی قسمت گھر پہ رکھی تھی

ان اشعار میں پوری انسانیت کا کرب جھلکتا ہوا نظر آتا ہے ان کی شاعری کے الفاظ جادوگری نہیں بلکہ فطرت انسانی کے نباض ہیں۔

''اندھیری رات'' کا استعارہ بہت خوب ہے یعنی اندھیری رات ہی صبح درخشاں کا پیام لے کر آتی ہے۔ دوسرے شعر میں افلاس زدہ شخص کی بے بسی وکرب کو بیان کیا گیا ہے یعنی غریبوں کے یہاں مالی تنگ دستی اپنے عروج پر ہے ان کے پاس پہننے کو مناسب لباس نہیں۔ تیسرے شعر میں شاعر اولوالعزمی کا درس دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہمیں قسمت کا پابند نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنی محنت پر بھروسہ کرنا چاہیے ہمارے عزائم جتنے بلند ہونگے منزل تک پہنچنے کا راستہ خود بخود آسان تر ہوتا جائے گا۔

ان کی شاعری نسل انسانی کو بیدار کرنے کے لیے ہے ان کی نصیحت کسی ناصح کی طرح پڑھنے والے کے ذہن و دل کو بوجھل نہیں کرتی بلکہ مسرت و بصیرت کے نئے دریچے وا کرتی ہے۔

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا
ہم سے پہلے بھی مسافر کئی گزرے ہوں گے
کم سے کم راہ کے پتھر تو ہٹاتے جاتے

یہاں ہم سفروں کی بے التفاتی اور ہم نشینوں کی بے توجہی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نامساعد حالات کا سامنا کرنے کے لیے ہمیں خود ہی تیار ہونا ہوگا کیوں اب معاشرہ ایسے لوگوں سے خالی ہو چکا ہے جو ہماری مزاج پرسی اور مسائل کے حل کے لیے کوشاں بھی ہوں۔ دوسرے شعر میں لوگوں کی غفلت بھری زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ لوگوں میں مروت و ہمدردی کے عناصر اپنی بنیادیں کھو چکے ہیں اب لوگ خودکسی پریشانی سے بچ کر نکل جائیں یہی ان کے لیے غنیمت ہے دوسروں کے لیے راستہ ہموار کرنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔ دراصل جدید دور میں انسانوں کی بے حسی واضح ہے جہاں انسانی اقدار شکست و ریخت کا شکار ہے اور بھلائی وانسانیت معدوم ہوتی چلی جارہی ہے۔

آج کل جائیداد اور وراثت کے لیے گھروں میں تناؤ کا ماحول پیدا ہوتا جارہا ہے جہاں ایک بھائی دوسرے بھائی کے لیے دیواریں کھڑی کرنے پر آمادہ وسینہ سپر ہے۔ خون کے رشتے ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہیں۔ راحت صاحب جب رشتوں میں بگاڑ کو دیکھتے ہیں تو ان کی حساس طبیعت خاموش نہیں رہتی یہاں بھی ان کا قلم رشتوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنی بیداری کا ثبوت دیتا ہے۔

مری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اٹھے
مرے بھائی مرے حصے کی زمیں تو رکھ لے

بزدلی موت کے مترادف ہے۔ خوف وہراس میں جینے والا تاریکیوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ کامیابی اسی کو ملتی ہے جس کے عزائم بلند ہوں اور جو ہر حال میں زندگی سے لڑنے اور اس سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

روایتوں کی صفیں توڑ کر بڑھو ورنہ
جو تم سے آگے ہیں وہ راستہ نہیں دیں گے
جگنوؤں کو ساتھ لے کر راتیں روشن کیجئے
راستہ سورج کا دیکھا تو سحر ہو جائے گی

ایک جگہ حوادث زمانہ سے نبرد آزما ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔

مجھے طوفانِ حوادث سے ڈرانے والو!
حادثوں نے تو مرے ہاتھ پہ بیعت کی ہے

خواب اور اسے تکمیلیت کے مرحلے تک پہنچانا بہادروں کا شیوہ ہے۔ کیوں کہ یہی خواب ہماری شخصیت کی تعمیر میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ ذیل کا شعر ان کی قوت ارادی کا غماز ہے۔

یہ ضروری ہے کہ آنکھوں کا بھرم قائم رہے
نیند رکھو یا نہ رکھو خواب معیاری رکھو

پروفیسر عنوان چشتی راحت اندوری کے فکر وفن کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں۔

''وہ اپنے دکھ سکھ کے ساتھ عام لوگوں کے دکھ سکھ کو جھیلتا ہے اس لیے اس نے سستی رومانیت ، لذتیت اور مردہ روایتوں کے جال کو توڑ کر گھر ، آنگن ، گلی ، محلہ ، گاؤں اور نگر کی فضا سے اپنے ذہن کا رشتہ استوار کیا ہے۔ اس نے اپنے ماحول میں بکھرے ہوئے زہر کو اپنے حواس خمسہ کی مدد سے جاگزیں کیا ہے اور اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی زندگی کو پوری شدت سے جینے کی کوشش کی ہے۔''

(نئی غزل کا قلندر مشمولہ لمحے لمحے ، راحت اندوری شاعر اور شخص مرتبہ طارق شاہین ،عزیز عرفان، الف پبلیکیشنز ، اندورص۔۱۰۶)

شاعر حساس اور نبض شناس ہوتا ہے۔ انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ رکھتا ہے۔ مذہبی منافرت ، فرقہ پرستی، انسانی اصول اقدار کا گلہ گھونٹ دیتی ہے فرقہ پرستی کی آگ دیش کے کونے کونے میں پھیلتی دیکھ کر ایک حساس شاعر کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ لیکن بڑا شاعر شاعر ہونے سے پہلے ایک بلند اخلاق کا اعلیٰ مجسمہ ہوتا ہے۔ وہ نفرت کا مقابلہ محبت اور بھائی چارگی سے کرتا ہے۔ راحت قومی یکجہتی اور انسانیت کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

آج ہم دونوں کو فرصت ہے چلو عشق کریں
عشق دونوں کی ضرورت ہے چلو عشق کریں
آپ ہندو میں مسلمان یہ عیسائی وہ سکھ
یار چھوڑو یہ تجارت ہے چلو عشق کریں

تعمیری اور اصلاحی پہلو ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ سماج سے جڑے ہر طبقے کا بھلا ہو۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ دبے کچلے اور کمزور طبقات کی حمایت میں آواز بلند کی ہے۔

عمر بھر چلتے رہے آنکھوں پہ پٹی باندھ کر
زندگی کو ڈھونڈ نے میں زندگی برباد کی

عام آدمی کے دکھ درد کا ترجمان ان کا یہ شعر ہے۔

اسے سامان سفر جان یہ جگنو لے لے
راہ میں تیرگی ہوگی مرے آنسو لے لے

شاعر ہر دور میں قوم وملت کی زبان رہا ہے۔ اپنے دور کا ترجمان رہا ہے۔ وہ چاہے علامہ اقبال کا دور رہا ہو یا میر و غالب کا۔ آج کا دور متنوع مسائل سے دو چار ہے۔ راحت صاحب سارے طبقات کی زبان بنے ہوئے تھے دیگر شعرا کے برخلاف راحت اندوری کا اسلوب کافی جدا گانہ رہا ہے۔ انہوں نے جو زبان اختیار کی وہ کافی سادہ اور سلیس ہے۔ کیا بوڑھے کیا نوجوان ان کی شاعری ہر ایک کی نوک زبان ہے۔

شاعر ہر دور میں قوم وملت کی زبان رہا ہے۔ اپنے دور کا ترجمان رہا ہے۔ وہ چاہے علامہ اقبال کا دور رہا ہو یا میر و غالب کا۔ آج کا دور متنوع مسائل سے دو چار ہے۔ راحت صاحب سارے طبقات کی زبان بنے ہوئے تھے دیگر شعرا کے برخلاف راحت اندوری کا اسلوب کافی جدا گانہ رہا ہے۔ انہوں نے جو زبان اختیار کی وہ کافی سادہ اور سلیس ہے۔ کیا بوڑھے کیا نوجوان ان کی شاعری ہر ایک کی نوک زبان ہے۔ سچ پوچھئے تو مشکل شاعری کرنا آسان ہے اور آسان شاعری کرنا مشکل۔ یہی جداگانہ بات راحت صاحب میں تھی وہ بہت ہی مشکل باتیں نہایت آسان لہجے میں کہہ جاتے تھے۔ یہی ان کا کمال ہے۔ بھاری بھرکم اور گاڑھی زبان کے ساتھ ان کے کلام کا کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ سامنے کی بات کو سادہ الفاظ میں کہنے کا ہنر وہ خوب جانتے تھے یہی ان کا کمال تھا کہ بات لوگوں کے دلوں میں اترتی تھی۔ ان کے اندر حس مزاح کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ بڑی شگفتہ مزاجی کے ساتھ شاعری کرتے تھے۔ وہ جتنے اچھے شاعر تھے، اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے۔ حالانکہ کہ عموماً دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ شعرا مشاعرے میں ایک دوسرے کو داد نہیں دیتے ہیں لیکن راحت صاحب کبھی بخالت سے کام نہیں لیتے تھے، اچھے اشعار پر وہ شاعر کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کی موت پر آج یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے ایک اہم شخصیت کو کھو دیا ہے۔

راحت اندوری ایک عہد ساز شاعر کا نام ہے ان کی شاعری عصری حسیت اور انسانی نفسیات کا خوبصورت اظہار ہے۔ شاعری میں انہوں نے کلاسیکی شاعری کو نئے انداز اور اپنے مخصوص اسلوب بیان کے ساتھ برتنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ اپنے ہم عصروں میں ایک ایسی ممتاز شخصیت جس نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ سادگی، صفائی حوصلہ مندی، بے باکی، بلند آہنگی، عصری چیرہ دستیوں کا بیان ان کی شاعری کی کل کائنات ہیں، جو ان کی شاعری کی پہچان اور عالمی سطح پر ان کی شناخت اور شاعرانہ تشخص کا ذریعہ بھی ہے۔

□□□

شہسوار اقلیم شعر ڈاکٹر راحت اندوری

ڈاکٹر محمد چاند نظامی

محلہ رومی
ضلع ہزاری باغ
(جھارکھنڈ)
رابطہ: 9431530920

17 مارچ 2016 کی وہ خوشگوار شام، کہ کھلے میدان میں بھی نہ سردی کا احساس ہو رہا تھا اور نہ گرمی پریشان کر رہی تھی، میری طرح کئی اہل ذوق کے لئے یادگار بن گئی۔ میں نے اپنی مختصر عمر میں اس سے پہلے کبھی کسی شاعر کیلئے اتنی دیوانگی نہیں دیکھی تھی، جبکہ اس سرزمین کو اردو کے نامور شعراء کی پابوسی کا شرف حاصل رہا ہے، البتہ بزرگوں سے ضرور سنا ہے کہ 80ء کی دہائی میں جناب بشیر بدر کو دیکھنے سننے کیلئے مقامی سنت کولمبس کالج میں لوگوں کا ہجوم اُمڈ پڑا تھا، لیکن اس کے بعد کسی شاعر کا جادو یوں سر چڑھ کر نہیں بول سکا۔

ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ ''ہزاری باغ مہوتسو'' کا آغاز مشاعرے اور کوی سمّیلن سے ہونا تھا۔ یہ ہزاری باغ کے سابق ڈپٹی کمشنر جناب مکیش کمار کی اردو دوستی کا نتیجہ تھا، مگر اس سے کہیں زیادہ وہ جناب راحت اندوری سے متاثر تھے، چنانچہ انہیں سننے کے لئے انہوں نے اس سالانہ مہوتسو سے مشاعرے اور کوی سمّیلن کو جوڑ دیا۔ معلوم نہیں راحت صاحب میں کیا بات تھی کہ اس اعلان کے ساتھ ہی پورے شہر و مضافات میں انتظار کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہوگئی اور صاحب سلامت کے بعد لوگوں کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا کہ 16 تاریخ کو راحت صاحب آرہے ہیں، جانا ہے نہ؟

حالانکہ اس مشاعرے کے شرکاء میں ڈاکٹر وسیم بریلوی اور محترمہ نصرت مہدی کے علاوہ ہندی کے کوی سرویش استھانہ اور اشوک چکر دھر کا نام بھی شامل تھا، مگر ان حضرات کا کہیں کوئی چرچا بھی نہیں ہوا۔ مشاعرے کے دن بھی وقت مقررہ چار بجے سے قبل ہی ونوبا بھاوے یونیورسٹی کے وسیع و عریض میدان کی تمام کرسیاں بھر چکی تھیں اور جنہیں کرسی نہیں ملی وہ بانس کی بلیوں اور زمین پر بیٹھے نظر آئے۔ سامعین میں مسلم اور غیر مسلم دونوں حضرات کی تعداد تقریباً برابر تھی اور ہر کوئی جناب راحت کو ہی سننے کا متمنی تھا۔ ویسے بعض حضرات سرویش استھانہ کی چٹکلے بازیوں سے بھی محظوظ ہونا چاہتے تھے اور یقینا جناب استھانہ نے تقریب کی لاج رکھ لی، کیونکہ جناب راحت رات 9 بجے تک مشاعرہ گاہ نہیں آسکے تھے، ان کی ٹرین 12 گھنٹے لیٹ تھی۔

اس دوران ڈاکٹر وسیم بریلوی، محترمہ نصرت مہدی اوراشوک چکردھر وغیرہ سب کو لوگ سن چکے تھے۔قریب تھا کہ مجمع مایوس ہوکر بکھر جاتا،مگر استھانہ نے لگاتار راحت صاحب کے جلد آنے کی خبر دیتے ہوئے اپنے چٹکلوں سے لوگوں کو باندھے رکھا۔

بالآخر رات 9-10 بجے کے بیچ جناب راحت ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھے۔ پورے مجمع نے کھڑے ہوکر تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ان کا خیر مقدم کیا ۔ راحت صاحب رونق اسٹیج ہوئے ،مگر چونکہ تمام لوگ اپنا کام کر چکے تھے ،اس لئے استھانہ نے انہیں ایک پل بھی دم لینے نہیں دیا اور فوراً مائیک تھمادی ۔ راحت صاحب نے پہلے مجمعے کا موڈ بھانپنے کے لئے امرود اور بارود جیسے قوافی والے ہلکے پھلکے اشعار سنائے ،پھر جلد ہی اپنے اصلی رنگ میں آ گئے۔ وہی رنگ جس نے انہیں نوجوان دلوں کی دھڑکن بنا دیا تھا اور بزرگوں میں بھی جوانی کا جوش بھر دیتا تھا۔ان کی بیباکی وحق گوئی تو پہلے سے ہی مشہور تھی ،لیکن یہاں بھی انہوں نے وزیر اعظم کو جس طرح مخاطب کر کے شعر خوانی کا آغاز کیا،اس نے کئی لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ایک تو سرکاری پروگرام اور سامنے وزیر تعلیم ڈاکٹر میرا یادو اور جناب راحت کا وزیر اعظم پر یہ طنز کہ ’’خدا کرے وہ ملک ہی میں ہوں اور میری آواز ان تک پہنچ جائے‘‘ پھر یہ شعر پڑھنا:

میں من کی بات بہت من لگا کے سنتا ہوں
یہ تو نہیں ہے تیرا اشتہار بولتا ہے
کچھ اور کام اسے جیسے آتا ہی نہیں
مگر وہ جھوٹ بہت شاندار بولتا ہے

ان کے مداحوں نے توتالیوں کی گڑگڑاہٹ سے پورے میدان کو لالہ زار بنادیا،مگر مودی بھکتوں کے لئے یہ کسی تازیانے سے کم نہ تھا ،وہیں بعض مصلحت پسند سہم رہے تھے کہ کہیں عدم برداشت کی اس فضا میں راحت

بالآخر رات 9-10 بجے کے بیچ جناب راحت ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھے۔ پورے مجمع نے کھڑے ہوکر تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ان کا خیر مقدم کیا ۔ راحت صاحب رونق اسٹیج ہوئے ،مگر چونکہ تمام لوگ اپنا کام کر چکے تھے ،اس لئے استھانہ نے انہیں ایک پل بھی دم لینے نہیں دیا اور فوراً مائیک تھمادی۔
راحت صاحب نے پہلے مجمع کا موڈ بھانپنے کے لئے امرود اور بارود جیسے قوافی والے ہلکے پھلکے اشعار سنائے ،پھر جلد ہی اپنے اصلی رنگ میں آ گئے۔ وہی رنگ جس نے انہیں نوجوان دلوں کی دھڑکن بنا دیا تھا اور بزرگوں میں بھی جوانی کا جوش بھر دیتا تھا۔ان کی بیباکی وحق گوئی تو پہلے سے ہی مشہور تھی ،لیکن یہاں بھی انہوں نے وزیر اعظم کو جس طرح مخاطب کر کے شعر خوانی کا آغاز کیا،اس نے کئی لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔
ایک تو سرکاری پروگرام اور سامنے وزیر تعلیم ڈاکٹر میرا یادو اور جناب راحت کا وزیر اعظم پر یہ طنز کہ ’’خدا کرے وہ ملک ہی میں ہوں اور میری آواز ان تک پہنچ جائے‘‘ پھر یہ شعر پڑھنا:

صاحب بھی کسی عتاب کا شکار نہ ہو جائیں ،مگر ان سب سے بے پرواراحت صاحب اپنی ہی دھن میں تھے اور پھر بات یہاں تک پہنچ گئی کہ

وہ چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا
میں اسکے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا

یہ وہ دور تھا کہ جب ملک میں فرقہ واریت عروج پر تھی۔ماب لنچنگ کے نام پر بے گناہوں کا بے دریغ قتل ہو رہا تھا۔لوگ اتنے ڈرے سہمے تھے کہ صدائے احتجاج بلند کرنے سے بھی ہچکچا رہے تھے۔اس مجرمانہ خاموشی کے بیچ ہندی اور انگریزی کے بعض ادباء وشعراء نے ایوارڈ واپسی کی مہم شروع کر کے حکومت وقت کو دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے کی بھرپور کوشش کی ،مگر افسوس کہ جو اردو ہمیشہ ظالموں کے خلاف سراپا احتجاج رہی ہے اور جس کی انقلابی نظمیں ایوان باطل پر لرزہ طاری کر دیتی تھیں، اس دور میں اس کے شعراء نے مصلحت پسندی کی چادر اوڑھ لی ۔حتیٰ کہ جب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کتابوں کی اشاعت کے لئے یہ شرط لگادی کہ ’’اس میں حکومت کے خلاف کوئی مواد شامل نہیں ہے‘‘ تب بھی ہمارے ادباء وشعراء کا ضمیر نہیں جاگا اور خوشی خوشی اس پر مہر تصدیق ثبت کر کے مفت میں اپنی کتابیں شائع کراتے رہے ۔اس دور میں مشاعرے بھی خوب ہوئے ،مگر کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ یہ کہہ سکے:

شاخوں سے ٹوٹ جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے
ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں
مجھے بھروسہ ہے اپنے لہو کے قطروں پر
میں نیزے نیزے کو شاخ گلاب کر دوں گا

جناب راحت کی یہی وہ انفرادیت تھی جس نے انہیں ہر دلعزیزی عطا کی اور لوگ سمجھنے لگے کہ کوئی تو ہے جو اس پر آشوب دور میں بھی

ان کی ترجمانی کررہا ہے۔اس لئے وہ جہاں جاتے تھے لوگ دیوانہ وار انکی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

راحت صاحب نے جس دور میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا وہ اردو شاعری کا جدید دور تھا ،ترقی پسندی کا رجحان تقریباً ختم ہو چکا تھا،لہٰذا انہوں نے بھی خالص رومانی شاعری سے ہی اپنے سفر کا آغاز کیا تھا،مگر ایک حساس شاعر کب تک زمانے کے نامساعدات سے بے پروارہ سکتا ہے اور کب تک رومان کی جھوٹی فضا میں سفر کرسکتا ہے۔آزادی کے بعد مسلمان جن آزمائشوں سے دوچار رہے ،کیا اسے نظر انداز کرنا کسی حقیقی شاعر کا منصب ہوسکتا ہے؟نہیں ہرگز نہیں، چنانچہ جلد ہی راحت صاحب نے اپنا لہجہ تبدیل کرلیا اور اسے ترقی پسندوں کے قریب لے گئے ،اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہم چاہے جتنا انکار کرلیں مگر عصری مسائل کی جتنی بہترین ترجمانی ترقی پسند شعراء نے کی ہے ،جدید شعراء اس میں ناکام رہے ہیں۔وہ شاعر ہی کیا جو اپنے گردوپیش سے متاثر نہ ہو اور اسے الفاظ کا پیکر عطا نہ کرسکے۔ زندگی کے لئے مسرت اگر ضروری ہے تو اس مسرت کو حاصل کرنے کے راستے تلاش کرنے ہوں گے اور اس راستے کے روڑوں کو بھی چننا پڑے گا، ورنہ رومان کی کیفیت سے سرشاری کا ہم بس خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ملک کی آزادی کے بعد مسلمان جن مسائل سے دوچار رہے ان میں ایک بڑا مسئلہ ان کی حب الوطنی پر شک کرنا تھا اور اب بھی ہے ۔حکومت خواہ کسی کی بھی ہو،مسلمان ہمیشہ فرقہ پرستی کی آگ میں جھلستے رہے ہیں۔ راحت صاحب نے نہ صرف اسے محسوس کیا بلکہ اس کا جواب بجائے مدافعانہ انداز میں دینے کے اس انداز سے گفتگو کی کہ محسوس ہوا کہ ہم اس ملک کے اتنے ہی حقدار ہیں جتنا کہ دوسرے:

سبھی کا خون ہے شامل یہاں کی مٹی میں

راحت صاحب نے جس دور میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا وہ اردو شاعری کا جدید دور تھا،ترقی پسندی کا رجحان تقریباً ختم ہو چکا تھا،لہٰذا انہوں نے بھی خالص رومانی شاعری سے ہی اپنے سفر کا آغاز کیا تھا،مگر ایک حساس شاعر کب تک زمانے کے نامساعدات سے بے پروارہ سکتا ہے اور کب تک رومان کی جھوٹی فضا میں سفر کرسکتا ہے۔آزادی کے بعد مسلمان جن آزمائشوں سے دوچار رہے،کیا اسے نظر انداز کرنا کسی حقیقی شاعر کا منصب ہوسکتا ہے؟نہیں ہرگز نہیں،چنانچہ جلد ہی راحت صاحب نے اپنا لہجہ تبدیل کرلیا اور اسے ترقی پسندوں کے قریب لے گئے،اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہم چاہے جتنا انکار کرلیں مگر عصری مسائل کی جتنی بہترین ترجمانی ترقی پسند شعراء نے کی ہے،جدید شعراء اس میں ناکام رہے ہیں۔وہ شاعر ہی کیا جو اپنے گردوپیش سے متاثر نہ ہو اور اسے الفاظ کا پیکر عطا نہ کرسکے۔زندگی کے لئے مسرت اگر ضروری ہے تو اس مسرت کو حاصل کرنے کے راستے تلاش کرنے ہوں گے اور اس راستے کے روڑوں کو بھی چننا پڑے گا،ورنہ رومان کی کیفیت سے سرشاری کا ہم بس خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔

کسی کے باپ کا ہندستان تھوڑی ہے
لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے

اور پھر ظالموں کو متنبہ کرتے ہوئے مظلوموں کو یوں تسلی دیتے ہیں:

جو آج صاحب مسند ہیں کل نہیں ہوں گے
کرائے دار ہیں ذاتی مکان تھوڑی ہے

اور واقعہ ہے کہ ملک میں جب CAA اور NRC کا قضیہ کھڑا ہوا تو 30 برس قبل کہا گیا راحت صاحب کا یہی ایک مصرع ''کسی کے باپ کا ہندستان تھوڑی ہے''پوسٹرز و بینرز کی زینت بن گیا۔ حیرت ہوئی کہ اس تحریک میں بھی جان پھونکنے کے لئے کسی ہمعصر شاعر کا کوئی کلام سامنے نہیں آسکا اور لوگوں کو اپنے احساسات کی ترجمانی کے لئے فیضؔ ، ساحرؔ ،مخدومؔ، کیفیؔ، اور جالبؔ جیسے ترقی پسندوں کا ہی سہارا لینا پڑا۔اس بیچ صرف اور صرف راحت صاحب ہی تھے جن کے اشعار کی گونج سنائی دی:

میں مرجاؤں تو میری الگ پہچان لکھ دینا
لہو سے میری پیشانی پہ ہندستان لکھ دینا
ہم اپنی جان کے دشمن کو اپنی جان کہتے ہیں
محبت کی اسی مٹی کو ہندستان کہتے ہیں

راحت صاحب کو زمانے کے بدلتے انداز کا واضح ادراک تھا اور یہ ادراک تو ان کے ہمعصروں کو بھی یقیناً ہوگا،مگر ان میں بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے کی ہمت نہ تھی۔ راحت صاحب خوش نصیب تھے کہ انہیں قدرت نے وقت کا نباض بھی بنایا تھا اور خوف وخطر سے خالی سینہ بھی عطا کیا تھا۔ اس لئے وہ اوروں کی طرح حالات سے سمجھوتہ کر لینے یا راہ فرار اختیار کر لینے کے قائل نہیں تھے، بلکہ حکومت وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا ہنر رکھتے تھے ۔انہیں اپنے شاندار ماضی کا بھی احساس تھا اور وہ ایمان ویقین اور لاتقنطو کی دولت سے بھی مالامال تھے۔ وہ جانتے تھے کہ

ہمارے مسائل ہماری حسن تدبیر سے ہی حل ہوں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ہمیں چراغ سمجھ کر بجھا نہ پاؤ گے
ہم اپنے گھر میں کئی آفتاب رکھتے ہیں
نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا

انہیں نوجوانوں کی کم ہمتی اور حوصلہ باختگی بھی پریشان کرتی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ نوجوان موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا سیکھیں:

لوگ ہر موڑ پہ رک رک کے چلتے کیوں ہیں
اتنا ڈرتے ہیں تو پھر گھر سے نکلتے کیوں ہیں
آنکھ میں پانی رکھو ہونٹوں پہ چنگاری رکھو
زندہ رہنا ہے تو ترکیبیں بہت ساری رکھو
ایک ہی ندی کے ہیں یہ دو کنارے دوستو
دوستانہ زندگی سے ،موت سے یاری رکھو
زندگی کو زخم کی لذت سے مت محروم کر
راستے کے پتھروں سے خیریت معلوم کر

اور ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف ناصح کی طرح دوسروں کے جذبات کو برانگیختہ کر دینے کو ہی اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے بلکہ وہ خود بھی ظلم کے آگے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے اور ارباب اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا ہنر جانتے تھے۔اس کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں،مگر یہاں میں ممبئی کے اس تاریخی مشاعرے کا ذکر کرنا چاہوں گا جسے گزشتہ برس محفل تہذیب وادب نے نیوز چینل ABP گنگا کے اشتراک سے منعقد کیا تھا۔وہ انتخابات کا دور تھا،ضابطہ اخلاق نافذ تھا۔حکومت کا رویہ یہ تھا کہ جس کسی نے اس کی نکتہ چینی کی اسے پابند سلاسل کر دیا گیا،مگر اس ماحول میں بھی راحت صاحب کے حوصلے پست نہیں ہوئے اور انہوں نے حکومت کی مکاریوں کو جس طرح واشگاف کیا،اس دور میں یہ انہی کا حصہ تھا۔ملاحظہ فرمائیے طنز کی چاشنی سے لبریز یہ چنندہ اشعار:

تری زبان کترنا بہت ضروری ہے
تجھے مرض ہے کہ تو بار بار بولتا ہے
کچھ اور کام تو جیسے اسے آتا ہی نہیں
مگر وہ جھوٹ بہت شاندار بولتا ہے

جھوٹوں نے جھوٹوں سے کہا ہے سچ بولو
سرکاری اعلان ہوا ہے سچ بولو
گھر کے اندر جھوٹوں کی ایک منڈی ہے
دروازے پر لکھ رکھا ہوا ہے سچ بولو
گلدستے پر یکجہتی لکھ رکھا ہے
گلدستے کے اندر کیا ہے سچ بولو

حکومت پر یوں براہ راست حملہ جان جوکھم میں ڈالنے کے مرادف تھا،مگر راحت صاحب نے تو برسوں پہلے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی تھی:

میں جانتا ہوں کہ دشمن بھی کم نہیں ہے
مگر ہماری طرح ہتھیلی پہ جان تھوڑی ہے

اور جب کوئی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اور سر پر کفن باندھ کر نکل پڑتا ہے تو دنیا اسے مرد مجاہد کہہ کر پکارتی ہے اور یقینا راحت صاحب ہمارے عہد کے مرد مجاہد تھے جو پورے دم خم کے ساتھ دشمنوں کو للکارتے رہے ۔

اب اپنے لہجے میں نرمی بہت زیادہ ہے
نئے برس میں نئی جنگ کا ارادہ ہے
جا کے یہ کہہ دے کوئی شعلوں سے چنگاری سے
پھول اس بار کھلے ہیں بڑی تیاری سے

بہر حال اس بیباکی و بے ساختگی کے ساتھ ساتھ راحت صاحب کے یہاں فن کا بھی جو پہلو نمایاں ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا اشعار سے کیا جاسکتا ہے۔جمہوری طرز حکومت میں صاحب اقتدار کو کرائے دار سے تشبیہ دینا، مسلمانوں کے دل میں ایمان ویقین کی جو روشنی ہے اسے کئی آفتاب کے استعاراتی پیرائے میں بیان کرنا اور ہتھیلی پر جان رکھنا جیسے محاوروں کے برمحل استعمال کے علاوہ اشعار میں رعایت لفظی ووسعت معنیٰ کا خیال رکھنا۔

یہ وہ وصف ہیں جن پر اہل نقد ونظر کو غور کرنا چاہئے اور انہیں وہ مقام دینا چاہئے جس کے وہ مستحق ہیں۔انہیں مشاعرہ باز شاعر کہہ کر نظر انداز کر دینا یقینا بے انصافی ہوگی اور مشرف عالم ذوقی کی یہ بات سچ ثابت ہو جائے گی کہ

''ہماری ادبی دنیا کی گروہ بندی نے
بہت سے حقیقی فنکاروں کو نظر انداز کر دیا۔''

راحت صاحب کی شخصیت وشاعری پر بہت پہلے ''لمحے لمحے'' نے ایک دستاویزی نمبر شائع کیا تھا۔اس کے بعد ان کی طرف سے ہمارے ادباء نے بالکل خاموشی اختیار کر لی، جبکہ راحت صاحب میں تخلیقیت کی جو ایک نئی دنیا آباد ہے اور انہوں نے غزل کو موضوعاتی اعتبار سے جو تنوع بخشا ہے اس پر نقد ونظر کی شعاعیں بکھیرنا ضروری ہے ،تا کہ ان کے کارنامے دوسروں کے لئے بھی مشعل راہ ثابت ہوں:

یہ سانحہ تو کسی دن گزرنے والا تھا
میں بچ بھی جاتا تو اک روز مرنے والا تھا
دو گز سہی مگر یہ میری ملکیت تو ہے
اے موت تو نے مجھے زمیندار کر دیا

□□□

مالوہ کی ماٹی کا شیر: راحت اندوری

استوتی اگروال

اگروال جویلرس
سرونج
(ایم پی)
رابطہ: 9575089694

راحت اندوری اردو شاعری کا ایک ایسا نام ہے جس نے اپنی گھن گرج سے شاعری میں ایک انقلاب برپا کیا۔ان کی شاعری میں سچائی اس طرح ابھرتی ہے کہ وہ ایک طاقتور لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔ راحت ؔ کبھی بھی سچ اور حق بات کہنے سے نہیں ڈرے۔ایسے طاقتور لہجے کے شاعروں میں راحت اندوری اور منّور رانا کا نام نمایاں طور پر لیا جا سکتا ہے۔سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ مشاعروں کے حوالے سے راحت اندوری نے اردو شاعری کے فروغ میں جو کردار ادا کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔بڑے بڑے شاعر ادیب ڈاکٹر راحت اندوری کے تحت میں شعر سُن کر سارے ترنم والے شاعروں کو بھلا دیتے ہیں نہ صرف انہیں بھلا دیتے ہیں بلکہ اُن کا چراغ راحت اندوری کے سامنے نہیں جلتا۔اُس کی زندہ مثال ان کے شعر ہیں،اُن کے شعروں میں جان ہے،ان کا انداز بالکل different ہے۔اُن کے شعروں میں اُلجھن نہیں ہے بلکہ ہر عمر کا شخص راحت ؔ کی شاعری آسانی سے سمجھ سکتا ہے چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھا ۔جب میں دس (10) سال کی تھی تو مجھے بھی راحت کے کئی شعر یاد ہو گئے تھے اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ پڑھتے وقت ان کا way of expression،اُن کی بلند آواز،ان کے لفظوں کا انتخاب اور شعر کو سمجھانے کا طریقہ ایسا ہوتا تھا کہ سامنے والا شعر سننے کے بجائے ان کے action سے ہی مطلب سمجھ لیتا تھا۔راحت اندوری سے متعلق اقبال مسعود نے ای ٹی وی انٹرویو میں کہا تھا:

''راحت اندوری کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی جو ہم نے اردو ادب کے کسی شاعر میں نہیں دیکھی بہت سے لوگ آئے جنہوں نے تحت میں پڑھا،انہیں تحت میں پڑھنے کا ملکہ حاصل تھا سردار جعفری آئے،کیفی اعظمی آئے لیکن راحت اندوری نے جو طریقہ کار دونوں جگہ وضع کیا پڑھنے کا اور لکھنے کا ایسا اب تک اردو ادب میں نہیں ہوا تھا۔اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ جن شبدوں کا وہ چناؤ کرتے تھے ان شبدوں کو جیتے تھے،جن شبدوں کا وہ اظہار کرتے تھے تو ان کا ہاؤ بھاؤ،ان کے ہاتھوں کی حرکت،ان کی آواز کا اتار چڑھاؤ اتنا صاف اور واضح ہوتا تھا کہ سامنے سننے والے کے اوپر پوری طرح سے منکشف ہو جاتا تھا''۔

حالانکہ کچھ نقادوں نے راحت اندوری کو صرف اس لئے نظر انداز کیا کیونکہ وہ مشاعروں کے شاعر تسلیم کئے جاتے تھے، چند نقادوں کے تسلیم نہ کرنے سے راحتؔ کا مرتبہ کم نہیں ہو جائے گا کیونکہ وہ لاکھوں دلوں پر راج کرتے تھے اور انہوں نے مشاعروں میں اردو شاعری کو جو بلندی عطا کی ہے اس کی مثال کسی شاعر کے ہاں بھی ملنا بہت مشکل ہے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی مشاعروں کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور مشاعرے کے حوالے سے اچھے شعر لوگوں تک پہنچائے ہیں۔ راحت اندوری کی کتاب ''کلام'' سے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں:

عمر بھر چلتے رہے آنکھوں پہ پٹی باندھ کر
زندگی کو ڈھونڈنے میں زندگی برباد کی

خبر ملی ہے کہ سونا نکل رہا ہے وہاں
میں جس زمین پہ ٹھوکر لگا کے لوٹ آیا ہوں

میں اس محلے میں اک عمر کاٹ آیا ہوں
جہاں پہ گھر نہیں ملتے مکان ملتے ہیں

سفر میں جب بھی ارادے جوان ملتے ہیں
کھلی ہوائیں کھلے بادبان ملتے ہیں

دیکھیں کس دن پہنچو گے تم تاروں تک
اونچائی تک اک سفر ہے دلدل کا

راحت صاحب کے ہر شعر میں انفرادیت ہے جس طرح پہلے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی تلاش میں وہ بھٹکتے رہے اور اپنی زندگی برباد کر دی یہ اسی طرح ہے جیسے ایک ہرن کستوری کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے کیونکہ اُس کی خوشبو اسے بار بار ستاتی رہتی ہے، لیکن وہ کستوری اُس کے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح راحت اندوری دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ اُس جگہ سے سونا نکل رہا ہے جہاں میری ٹھوکر لگی تھی۔ اگلے شعر میں راحت گھر اور مکان میں فرق بتاتے نظر آتے ہیں۔ آگے کہتے ہیں کہ جب ہم بغیر رکے چلتے رہتے ہیں اور ہماری آنکھیں میل کا پتھر نہیں دیکھتیں تو ہمیشہ ہمارے ارادے جوان رہتے ہیں اور ہمیں کھلی ہوائیں اور بادبان ملتے ہیں لیکن اُس کے لئے شرط یہ ہے کہ ہمیں پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا۔

چند شعر اور پیش کئے جاتے ہیں:

پھر شوق سے بڑھانا اِدھر دوستی کا ہاتھ
پہلے تُو مجھ کو اچھی طرح دیکھ بھال لے

چمکتے لفظ ستاروں سے چھین لائے ہیں
ہم آسماں سے غزل کی زمین لائے ہیں

وہ سامنے پہاڑ ہے حسرت نکال لے
تیشہ نہیں تو پھول کا ریشہ نکال لے

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

راحتؔ صاحب کہتے ہیں کہ تم میری طرف دوستی کا ہاتھ بعد میں بڑھانا پہلے مجھے اچھے طرح سمجھ لو چونکہ کوئی بھی بات سمجھنے کے لئے ذات سمجھنا پہلا فرض ہے بقول فیض احمد فیض:

''بات کے اندر کی بات سمجھنے کے لئے ذات کے اندر کی ذات سے رابطہ ہونا ضروری ہے''۔

راحت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جھوٹے دعوے نہیں کرتے ، بلکہ وہ الفاظ کے انتخاب کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں انہوں نے بعض ایسے کھردرے الفاظ کو بھی نئی زندگی عطا کی ہے جنہیں عام شاعر استعمال کرنا ہی نہیں جانتا دیکھئے:

میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی
داد لوگوں کی، گلا اپنا، غزل استاد کی

راحت اندوری راگ نہیں الاپتے بلکہ خود

راحت صاحب کے ہر شعر میں انفرادیت ہے جس طرح پہلے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی تلاش میں وہ بھٹکتے رہے اور اپنی زندگی برباد کر دی یہ اسی طرح ہے جیسے ایک ہرن کستوری کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے کیونکہ اُس کی خوشبو اسے بار بار ستاتی رہتی ہے لیکن وہ کستوری اُس کے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔

اسی طرح راحت اندوری دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ اُس جگہ سے سونا نکل رہا ہے جہاں میری ٹھوکر لگی تھی۔ اگلے شعر میں راحت گھر اور مکان میں فرق بتاتے نظر آتے ہیں۔

آگے کہتے ہیں کہ جب ہم بغیر رکے چلتے رہتے ہیں اور ہماری آنکھیں میل کا پتھر نہیں دیکھتیں تو ہمیشہ ہمارے ارادے جوان رہتے ہیں اور ہمیں کھلی ہوائیں اور بادبان ملتے ہیں لیکن اُس کے لئے شرط یہ ہے کہ ہمیں پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا۔

چند شعر اور پیش کئے جاتے ہیں:

پھر شوق سے بڑھانا اِدھر دوستی کا ہاتھ
پہلے تُو مجھ کو اچھی طرح دیکھ بھال لے

کی زمین تلاش کرتے ہیں۔ان کی شاعری روایتی نہیں ہے بلکہ شاعری میں نیاپن ہے، نئے قافیے ہیں، نئی زمین ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ایک بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں کسی نے صحیح کہا ہے:

''شاعر وہ ہی بڑا ہوتا ہے جو اپنی زمین خود نکالتا ہے''۔

اور راحت نے اپنی ہر غزل میں اپنی زمین خود پیدا کی ہے اگلے شعر میں راحت صاحب شیریں اور فرہاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک تاریخی واقعہ بیان کر رہے ہیں۔اس کے بعد والے شعر میں بھی وہ ایک historical بات کہہ رہے ہیں کیونکہ لگ بھگ 600 سال مسلم حکومت رہی ہے اور اسی دور میں ہندوستان کو Golden bird یعنی سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔

راحت اندوری نے اپنی شاعری میں زندگی کے تمام تجربے بیان کئے ہیں۔ایک مرتبہ راحت کالج کے مشاعرے میں شعر پڑھ رہے تھے کہ اچانک کالج کی لڑکیاں ہنسنے لگیں تو انہوں نے اسی وقت انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہ غزل پڑھی ہیں:

چاند ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا میرے جام کا ہے
یہ میرا قول نہیں حضرتِ خیام کا ہے
ہم سے پوچھو کہ غزل مانگتی ہے کتنا لہو
سب سمجھتے ہیں یہ دھندا بڑے آرام کا ہے
اب تیری باری ہے آئینہ بچا لے اپنا
میرے ہاتھوں میں جو پتھر ہے تیرے نام کا ہے
پیاس اگر میری بجھا دے تو میں جانوں
تو سمندر ہے تو ہوگا میرے کس کام کا ہے

راحت اندوری کہتے ہیں:

''یہ میرا ایمان ہے یہ میرا ماننا ہے کہ جہاں جہاں محبتیں ہیں وہاں ایک کتاب ہے، جہاں نفرتیں ہیں وہاں ایک کتاب ہے ، جہاں جنگ ہے وہاں ایک کتاب ہے، جہاں امن ہے وہاں ایک کتاب ہے، جہاں دھرم ہے وہاں ایک کتاب ہے اور جہاں ادھرم ہے وہاں بھی ایک کتاب ہے اور اسی موضوع پر میں نے یہ شعر کہا:

جہالتوں کے اندھیرے مٹا کے لوٹ آیا
میں آج ساری کتابیں جلا کے لوٹ آیا

راحتؔ صاحب کہتے ہیں کہ تم میری طرف دوستی کا ہاتھ بعد میں بڑھانا پہلے مجھے اچھے طرح سمجھ لو چونکہ کوئی بھی بات سمجھنے کے لئے ذات سمجھنا پہلا فرض ہے بقول فیض احمد فیض:

''بات کے اندر کی بات سمجھنے کے لئے ذات کے اندر کی ذات سے رابطہ ہونا ضروری ہے۔''

راحت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جھوٹے دعوے نہیں کرتے ، بلکہ وہ الفاظ کے انتخاب کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

انہوں نے بعض ایسے کھردرے الفاظ کو بھی نئی زندگی عطا کی ہے جنہیں عام شاعر استعمال کرنا ہی نہیں جانتا دیکھئے:

میرے کاروبار میں سب نے بڑی امداد کی
داد لوگوں کی، گلا اپنا، غزل استاد کی

راحت اندوری راگ نہیں الاپتے بلکہ خود کی زمین تلاش کرتے ہیں۔ان کی شاعری روایتی نہیں ہے بلکہ شاعری میں نیاپن ہے، نئے قافیے ہیں، نئی زمین ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ایک بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں کسی نے صحیح کہا ہے....

آگے لکھنے سے پہلے راحت اندوری سے متعلق چند مشہور شخصیات کی رائے یہاں پیش کرنا مناسب ہوگا:

دلیپ کمار راحت اندوری کی کتاب ''کلام'' پہ لکھتے ہیں:

'راحت کے کلام میں برجستگی، معنی آفرینی اور دورِ حاضر کا عکاس ہے۔'

شہزاد انجم نے لکھا ہے:

'اردو کے سفیر تھے راحت اندوری'

عبدالحئی کہتے ہیں:

'پربتوں سے لڑنے والا شاعر تھا راحت اندوری'

ف۔س۔اعجاز کے مطابق:

' راحت اندوری پبلک کی نبض جانتے تھے'

سیفی سرونجی لکھتے ہیں:

''راحت اپنی شاعری میں نئے قوافی ، نئی ردیفیں میں اتنی مہارت رکھتے تھے کہ الفاظ ہیرے کی مانند جگمگانے لگتے تھے''۔

مہتاب عالم کہتے ہیں:

'راحت کی شاعری کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اختر شیرانی کو دل میں بٹھایا، ساحر کو اپنایا، مجاز سے پیار کیا، مخدوم پر اعتبار کیا اور فیض سے فیض یاب ہوئے تب کہیں جا کر کوچۂ سخن میں کامیاب ہوئے۔'

راحت ایک ایسا شاعر تھا جو ہمارے بیچ روشنی پھیلاتا تھا، لیکن افسوس اب وہ ہمارے بیچ نہیں رہا جو شخص دنیا میں آتا ہے اُسے ایک نا ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔گوپال داس نیرج نے صحیح کہا ہے:

صرف بچھڑنے کے لئے ہے یہ میل ملاپ
ایک مسافر ہم یہاں ایک مسافر آپ

□□□

حق گوئی وبیباکی کا نقیب : راحت اندوری

سفیان احمد انصاری

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو
لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ

رابطہ: 9839574196

بین الاقوامی شہرتوں کے مالک، اُردو شعر وسخن کے بے تاج بادشاہ ڈاکٹر راحت اندوریؔ کی ولادت یکم جنوری 1950ء کو مدھیہ پردیش کے اندور میں ہوئی۔ اصلی نام راحت اللہ اور تخلص راحتؔ تھا۔ والد کا نام رفعت اللہ قریشی اور والدہ کا نام مقبول النساء بیگم تھا۔ اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھے راحت اندوریؔ۔

ابتدائی تعلیم نوتن اسکول اندور میں ہوئی، اسلامیہ کریمیہ کالج اندور سے 1973ء میں گریجویشن کیا، 1975ء میں برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے اُردو ادب میں ایم اے کیا، 1985ء میں مدھیہ پردیش بھوج یونیورسٹی سے اُردو ادب میں پی ایچ ڈی (Ph.D) کی ڈگری حاصل کی، مدھیہ پردیش کے ایک کالج میں اُردو کے پروفیسر بھی رہے، جہاں انھوں نے پندرہ سال تک اُردو غزل پڑھائی (جیسا کہ انھوں نے خود کئی مشاعروں میں یہ بات کہی ہے) پھر استعفیٰ دے دیا تھا، استعفا کی وجہ (بعض متعلقین کے بقول) راحتؔ اندوری نے یہ بیان کی کہ:

''پیشۂ مدرّسی سے انصاف نہیں ہو پا رہا تھا، مہینہ میں پندرہ بیس دن تو باہر رہتا ہوں اور تنخواہ پوری ملتی ہے جس کو میں جائز نہیں سمجھتا۔''

اٹھارہ برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کی، ملک و بیرون ملک اور عالمی مشاعروں میں شرکت کی اور اپنا کلام نہایت دلیری کے ساتھ سناتے۔ جس مشاعرے میں بھی شرکت کی وہ مشاعرہ کامیابیوں سے ہم کنار ہوا، بلکہ یہ بات زبان زدِ عوام وخواص تھی کہ راحت اندوریؔ مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہیں، کوئی بھی مشاعرہ ہو وہ راحت اندوریؔ کی محض تشریف آوری سے کامیاب سمجھا جاتا تھا۔

راحت اندوریؔ کے شعری مجموعوں میں دھوپ دھوپ، میرے بعد، پانچواں درویش، ناراض اور موجود کے نام قابل ذکر ہیں۔ بحیثیت انسان وہ انتہائی مخلص، متواضع اور بڑے خوددار تھے، انھوں نے کبھی اپنی خودداری سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

وہ ایک عظیم انسان، غریب پرور، انسانیت سے ہمدردی رکھنے والے نیک دل، نیک فطرت اوراعلیٰ اخلاق وکردار کے مالک تھے،جن کی نظیر موجودہ دور میں ملنا محال وناممکن تونہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ الغرض لوگوں کو محبت ،امن اور اخوت کا درس دینے والا یہ عظیم شاعر اپنے بے شمار محبّین اور چاہنے والوں کو سوگوار کرکے 70 سال کی عمر میں 11 /اگست 2020ء بوقت سہ پہر اس دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کرگیا۔(اللہ مغفرت فرمائے۔)خودفرماتے تھے:

جنازے پر مرے لکھ دینا یارو!
محبت کرنے والا جارہا ہے

شعری امتیازات وخصوصیات:

راحت اندوریؔ کی شاعری بڑی عام فہم اور دل کو چھو لینے والی ہوتی تھی،وہ اپنے رنگ وآہنگ میں منفرد تھے، اورعصری حسیت کے بڑے ممتاز شاعر تھے، وہ حالات و واقعات کو بڑی جرأت کے ساتھ منتخب لفظوں کا جامہ پہنا دیتے تھے،ان کے شعر پڑھنے کا انداز دوسرے شعراء سے بالکل مختلف تھا، وہ مشاعرہ میں اپنے الفاظ وانداز سے چھاجاتے تھےاورسامعین کے دماغ کواپنی شاعری سے باندھ لیتے تھے،اُردو اور ہندی دونوں طبقے کے لوگ ان کی شاعری کے گرویدہ تھے۔

راحت اندوریؔ کے اشعار میں حقیقت شناسی، حکمت و دانائی، خود داری، بے نیازی کا عنصر غالب نظر آتا ہے،اُن کا شعری جذبہ پوری کیفیت کے ساتھ شعر میں ڈھلتا تھا اور وہ سامعین کو اپنے شعر کی اصلی شکل دکھاتے تھے۔ الفاظ میں صورت گری آسان نہیں۔ اُن کے ہاں ادبیت کے ساتھ سماجی اور سیاسی پہلو پوری قوت کے ساتھ بیان ہوتے تھے۔ شاعری برائے شاعری ہی نہیں برائے زندگی بھی تھی۔ باطل سے دبنا اور اس کے سامنے جھکنا راحت اندوریؔ کی سرشت میں تھا ہی نہیں، وہ اپنی اسی فطرت کا برملا اظہار یوں کرتے ہیں کہ ؎

شاخوں سےٹوٹ جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے
جو ہیں مجرم انھیں سولی پہ چڑھا دو لیکن
ہر مسلمان کو داؤد نہ سمجھا جائے
وہ گردن ناپتا ہے ناپ لے
مگر ظالم سے ڈر جانے کا نہیں

اپنے وطن عزیز سے محبت والفت (چند شر پسند عناصر کو چھوڑ کر) ملک کے ہر باشندہ کو ہے،لیکن راحت اندوریؔ کے دل میں وطن عزیز کی محبت اور لگاؤ عشق کے درجہ کا تھا۔ مسلمانوں کے قلب وجگر میں اور خودراحت اندوریؔ کے دل ودماغ میں وطن کی عظمت اوراس کی محبت کس قدر موجزن ہے اس کا برملا اظہار وہ اپنے اشعار میں جابجا کرتے نظر آتے ہیں۔

عموماً مشہور ہے کہ راحت اندوریؔ رند بلا نوش اور بادہ خوار تھے، جن کو اللہ اور رسول، آخرت، جنت اور جہنم سے کیا تعلق؟ لیکن اُن کے نعتیہ اشعار کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا سینہ عشقِ نبوی اور محبت رسولؐ سے سرشار تھا،ان کے قلب وجگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت بھی حددرجہ موجود تھی، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی غزل گوئی میں صَرف کردی لیکن کبھی کبھار محبتِ رسولؐ سے سرشار ہوکر نعتیہ کلام بھی لکھے اور اس میں اپنے نبی سے محبت والفت کا درس اور مقامِ نبوت وشانِ رسالت کو بڑے اچھوتے اور دل کش پیرایے میں بیان کیا، چنانچہ وہ وہ بارگاہ رسالتؐ میں نذرانۂ عقیدت کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

سبب تخلیق دنیا کا جہاں جب بھی کہیں لکھا
محمدؐ اولیں لکھا، محمدؐ آخری لکھا
بند آنکھیں ہیں چار سو ہیں آپؐ
اِس اُجالے کی آبرو ہیں آپؐ
نعت پڑھتا ہوں اور لرزتا ہوں
ایسا لگتا ہے رُوبرو ہیں آپؐ

راحتؔ کے شعری مجموعہ میں ایک ایسا کلام بھی نظر پڑتا ہے جس کے بارگاہِ خداوندی میں قبولیت کی امید قوی نظر آتی ہے،آخرت کی فکر، روزِ محشر کی حاضری، خدا کے سامنے باز پُرس، عذاب کا خوف وڈر اور ارحم الراحمین سے رحم وکرم کی اُمید پر مشتمل کلام ملاحظہ فرمائیں

تمام محفل پہ چھا رہا ہوں،
میں بن پیے لڑکھڑا رہا ہوں
میں مست ہوں پی کر کے جامِ احمدؐ،
شراب لے کر میں کیا کروں گا
ہے عرض ربِّ جلیل میرے،
ترے نبی ہیں وکیل میرے
سوال لے کر تو کیا کرے گا،
جواب لے کر میں کیا کروں گا
مزہ تو جب آئے روزِ محشر،
کہ مجھ سے خود کہہ دے ربِّ اکبر
مرے محمدؐ کا امتی ہے،
حساب لے کر میں کیا کروں گا

اللہ تعالیٰ کی رحمتِ بے کراں اور بندوں سے بے انتہا محبت کے یقین کامل اور حضورؐ کی شفاعت پر اعتماد کرتے ہوئے راحت اندوریؔ

فرماتے ہیں:

اے خدا! پھر یہ عذاب اور یہ ستم کس کے ہیں
تُو تو اِس بات سے واقف ہے کہ ہم کس کے ہیں

میں مطمئن ہوں شفاعت مرے رسولؐ ہے
رسولؐ میرے ہیں جنت مرے رسولؐ کی ہے

جس طرح اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرشار ہوکر اُس کی حمد وثنا کرنا عبادت اور نیکی ہے، اسی طرح حُبِ نبیؐ میں ڈوب کر نبیؐ کی تعریف وتوصیف کرنا، مدح وستائش کے قصیدے پڑھنا اور نعت کہنا، لکھنا اور پڑھنا بھی عظیم عبادت ہے، اور آج تک دنیا کے تمام شعرا نے اپنی کوشش کے بقدر نعتیں کہیں لیکن آخر میں انھیں یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ نبیؐ کی تعریف وتوصیف کرنے کا حق کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا۔ یہی اعتراف راحت اندوریؔ بھی کرتے ہیں ؎

زم زم و کوثر و تسنیم نہیں لکھ سکتا
یا نبیؐ ! آپ کی تعظیم نہیں لکھ سکتا
میں اگر سات سمندر بھی نچوڑوں راحتؔ
آپؐ کے نام کی ایک میم نہیں لکھ سکتا

راحت اندوریؔ کا حضورؐ کی تعریف میں لکھا ہوا یہ قطعہ اگر مقبولِ بارگاہِ رسالت ہوگیا تو تمام عمر کی غزل گوئی بھی کامیاب ہوگئی۔ اس طرح نعت گوئی میں زندگی گزارنے کی تمنّا کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر نصیب قریبِ درِ نبیؐ ہوجائے
مری حیات مری عمر سے بڑی ہوجائے
میں م ح لکھوں پھر م د لکھوں
خدا کرے! یوں ہی ختم زندگی ہوجائے

ان نعتیہ اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ راحت اندوریؔ کے سینہ میں ایک ایسا دل تھا جسے معرفتِ خداوندی حاصل تھی، ساتھ ہی حبِّ نبیؐ اور عشق رسولؐ بھی قلب وجگر میں موجزن تھا، جبھی ان کے اشعار حب الٰہی پر مشتمل، دین اسلام کی خوبیوں سے لبریز، عشق مصطفیؐ سے پُر ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح راحت اندوریؔ کے اشعار میں فصاحت وبلاغت، استعارہ وتمثیل اور مجاز وکنایہ کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ تشبیہ وتمثیل کی ایک مثال دیکھئے ؎

مرے پیمبرؐ کا نام ہے جو
مری زباں پر چمک رہا ہے
گلے سے کرنیں نکل رہی ہیں
لبوں سے زَم زَم چھلک رہا ہے
میں رات کے آخری پہر میں
جب آپؐ کی نعت لکھ رہا تھا
لگا کہ الفاظ جی اٹھے ہیں،
لگا کہ کاغذ دھڑک رہا ہے
مرے نبیؐ کی دعائیں ہیں یہ
مرے خدا کی عطائیں ہیں یہ
کہ خشک مٹی کا ٹھیکرا بھی،
حیات بن کے کھنک رہا ہے

اس کے علاوہ راحت اندوریؔ کو موت، جنت وجہنم اور فکر آخرت کا استحضار بھی ہمہ وقت رہتا تھا، جس کا نمونہ ذیل کے اشعار میں ملاحظہ فرمایئے:

دوزخ کے انتظام میں اُلجھا ہے رات دن
دعویٰ یہ کر رہا ہے کہ جنت میں جائے گا
خوش فہمیوں کی بھیڑ میں تو بھول کیوں گیا
پہلے مرے گا بعد میں جنت میں جائے گا

خلاصہ یہ کہ راحتؔ کے اشعار نپے تلے، عام فہم، سلیس اور عمدہ پیرایہ میں ہوتے تھے، وطن عزیز کی محبت سے سرشار ہوتے تھے، حالات حاضرہ کے مطابق نہایت عمدہ اور دلچسپ شعر کہتے، عوام الناس اور علمی وادبی حلقوں میں داد وتحسین وصول کرتے، مخاطب اپنے کو بناتے اور آخرت کی فکر و یاددہانی سب ہی کو کراتے۔ یہ تھی ڈاکٹر راحت اندوری کی شاعری اور ان کی خوبیاں، جسے آج ہر کس وناکس ہندو مسلم، سکھ، عیسائی، سب خوب مزے لے کر گنگنا رہے ہیں۔ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن، ہر بزمِ یار اور بزمِ محبت کی شان، مشاعروں اور سیمیناروں کی جان جنھوں نے شعر وشاعری کی دنیا میں نصف صدی تک دھوم مچایا تھا، وہ شعری منظر پر اس طرح سے چھائے ہوئے تھے کہ سامعتوں سے اتر کر دل میں سما گئے۔ انہوں نے اپنی طرحدار شاعری سے اک زمانے کو متاثر کیا۔ انتقال کے دوسرے روز سوشل میڈیا کے ذریعہ معلوم ہوا کہ وفات سے قبل ایک غزل کہی تھی جسے بعدِ وفات ان کے بیٹے ستلج راحتؔ نے سوشل میڈیا پر وائرل کی، جس کا آخری شعر گویا انھوں نے خاص اپنے ہی لیے کہا ہو، فرماتے ہیں ؎

وبا نے کاش ہمیں بھی بلا لیا ہوتا
تو ہم پہ موت کا احسان بھی نہیں ہوتا

اسی طرح ان کا یہ شعر بھی ان کے انتقال کے بعد کافی وائرل ہوا کہ

یہ سانحہ تو کسی دن گزرنے والا تھا
میں بچ بھی جاتا تو اک روز مرنے والا تھا

افواہ تھی کہ میری طبیعت خراب ہے
لوگوں نے پوچھ پوچھ کے بیمار کردیا
دو گز سہی مگر یہ مری ملکیت تو ہے
اے موت! تو نے مجھ کو زمیں دار کردیا

□□□

مجھے آج سہ ماہی ''ادبی نشیمن'' کی صورت میں آپ کی نوازشیں موصول ہوئیں۔ رسالے کے مشمولات کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی کیوں کہ مضامین اور دوسری ادبی تخلیقات کے حسنِ انتخاب میں ضمن میں دل سے واہ نکلی۔ ہم سب موجودہ لسانی تعصب سے واقف ہیں جس کی رُو سے بہار اور جموں وکشمیر میں حالیہ دنوں میں اُردو کے ضمن میں کچھ فیصلے لیے گئے جو مستقبل میں اس زبان کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ جہاں ایک طرف بہار میں لازمی زبان کی حیثیت سے اس کی تدریس ختم کردی گئی وہیں دوسری طرف پارلیمنٹ کے ایکٹ مورخہ ۲۲ ستمبر ۲۰۲۰ کے مطابق جموں وکشمیر میں اردو کے ساتھ اور چار زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دے کر ایک نئی پیچیدہ صورتِ حال پیدا کی گئی۔ اربابِ اقتدار کی سیاسی کوتاہ بینی اپنی جگہ لیکن خود بہار میں وہ لوگ خاموش ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ جموں وکشمیر میں پچھلی تین دہائیوں اور بالخصوص اگست ۲۰۱۹ء سے جو صورتِ حال بنی ہوئی ہے اُس صورت میں اردو کے تحفظ کی بات کرنا ناممکن ہے۔ اس ساری صورت حال میں ہمارے اخبارات اور رسائل سے وابستہ مدیروں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ رائے عامہ بنانے اور اُردو سے محبت کرنے والوں کو مجتمع کر کے متعلقہ حکومتوں پر جمہوری طریقے پر دباؤ ڈالیں تاکہ اُردو اپنے ہی دیس میں اجنبی نہ رہے۔ رسالے کی پشت پر ''دستاویز'' کے نام سے جو تحریر آپ نے شائع کی ہے وہ یقینا قابلِ تعریف ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں فوراً اس رسالے کا زرخریداری ارسال کروں گا۔

ڈاکٹر الطاف انجم

کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

ادبی نشیمن کا ستمبر تا نومبر 2020 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس شمارے کا سروق، جس میں ایک دکان دار کتابوں کے مطالعے میں غرق ہے، اور اس کے احاطے میں کتابیں ہی کتابیں سلیقگی کے ساتھ رکھی ہیں، اتنا دیدہ زیب ہے کہ قاری خود بہ خود اس کی جانب متوجہ ہو جائے۔ مشمولات میں مضامین، افسانے، منظومات، انشائیہ اور مراسلات وغیرہ قابلِ مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر ایم۔اے حق کا مضمون ''افسانچوں کی عالمی گونج''، میں موصوف نے اس بات کو واضح کیا کہ افسانچے ہندوستانی زبانوں میں ہی تخلیق نہیں کیے جا رہے بلکہ دنیا کی ہر زبان میں اور ہر دور میں ان پر طبع آزمائی ہوتی رہی ہے۔ محمد نہال افروز کا مضمون ''احمد رشید کے افسانوں میں گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی'' بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ موصوف نے احمد رشید کے افسانوں کے حوالے سے گنگا جمنا تہذیب پر تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار الحق نے اپنے مضمون میں عامر عثمانی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کی معیار بندی کا کام کیا ہے۔ سلیم انصاری کی نظم 'مری نظموں کو پڑھ کر کیا کروگے'' کے عنوان کی طرح پوری نظم واقعی معنی خیز اور دلچسپ ہے۔ رسالہ انتساب کی نائب مدیر استوتی اگروال نے اپنی نظم میں عام آدمی کی نمایندگی کی ہے۔ من جملہ ادبی نشیمن لکھنؤ اُردو شاعروں اور نثاروں کا نیا نشیمن بن کر اُبھرا ہے۔ میں مدیرِ رسالہ ڈاکٹر سلیم احمد کو اس خوب صورت پرچے کو شائع کرنے پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ابراہیم افسر

نگر پنچایت سِوال خاص، میرٹھ

رسالہ سہ ماہی ''ادبی نشیمن''، ستمبر تا نومبر 2020 موصول ہوا۔ جاذب نظر کور پیج کے ساتھ ساتھ سرورق کے اندر گلزار دہلوی، راحت اندوری کو خراج عقیدت پیش کردہ تحریر نے آنکھوں کو نم کردیا۔ اردو ادب کی دو عظیم شخصیت پر گوشے شایع کرنے کا ادارہ قابل تحقیق اور مبارکباد ہے۔ ڈاکٹر سلیم احمد مدیر ''ادبی نشیمن'' نے جو خصوصی شمارہ شایع کرنے کا ادارہ کیا ہے وہ اردو داں، اسکالروں محققین اور قارئین کے لیے بہترین ادبی سرمایہ ہوگا۔ رسالے کے تمام مضامین حمد، نعت، مضامین، منظومات، انشائیہ، مراسلات وغیرہ کا انتخاب مدیر کی علمی لیاقت کو ظاہر کرتا ہے۔ رسالہ میں شائع مضامین دیکھ کر خوشی ہوئی خاص کر نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہے نیز تحقیق کرنے کا مواد وافر مقدار میں موجود ہے۔ ہر رسالہ کی کامیابی کا ضامن اچھے مضامین کا انتخاب اور ساتھ ہی محقق اور ریسرچ اسکالرس اور ادبا وغیرہ کے مضامین کو شایع کرنا ہوتا ہے تاکہ قائین ہر طرح کے مضامین کا لطف اٹھا سکیں۔ رسالہ کے پشت تحریری شکل میں ''دستاویز'' کے عنوان سے ''تاریخ ادبیات'' گورکھپور میں نہایت مفید، معلوماتی مضمون ہے جسے میں ہمیشہ خصوصی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہوں ساتھ امید ہے کہ اسے قارئین بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہوں گے۔

محمد رضا ایلیا (یورہ رانی، مبارکپور، اعظم گڑھ)

❑❑❑

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلبا کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں/دارالمطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادبا کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی 'اکادمی' اور ماہنامہ 'خبرنامہ' کی اشاعت ☆ سیمینار سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ اردو آئی اے ایس اسٹڈی سینٹر کا 'پارہ' موہان روڈ، لکھنؤ میں قیام: بچوں کا رسالہ 'باغیچہ' کی اشاعت، اردو ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ

اتر پردیش اردو اکادمی کی اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت
۱	ساغر خیامی	ناشر نقوی	215/-
۲	مظہر امام	امام اعظم	208/-
۳	انتظار شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	270/-
۴	پیغام آفاقی	خان محمد آصف	224/-
۵	سالک لکھنوی	پروفیسر مظفر حنفی	216/-
۶	متین طارق باغپتی	ڈاکٹر ذکی طارق	216/-
۷	پروفیسر قمر رئیس	پروفیسر توقیر احمد خاں	245/-
۸	ڈاکٹر اسعد بدایونی	حسیب سوز	245/-
۹	حفیظ میرٹھی	تابش مہدی	245/-
۱۰	عابد سہیل	ڈاکٹر صبیحہ انور	245/-
۱۱	جوگیندر پال	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	287/-
۱۲	تعلیم نسواں	نسرین احمد	170/-
۱۳	روح نظیر	مخمور اکبرآبادی	96/-
۱۴	روشنی کے دریچے	سید احتشام حسین	43/-
۱۵	مثنوی سحرالبیان	میر حسن	108/-
۱۶	مثنوی گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم	70/-
۱۷	اعتبار نظر	سید احتشام حسین	105/-
۱۸	انیسیات	سید مسعود حسن رضوی	91/-
۱۹	پریم چند نئے تناظر میں	پروفیسر علی احمد فاطمی	80/-
۲۰	تنقیدی نظریات (اول)	سید احتشام حسین	58/-
۲۱	تنقیدی نظریات (دوم)	سید احتشام حسین	52/-
۲۲	تنویر التشمس	منشی شمس الدین اعجاز رقم	20/-
۲۳	گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ	عشرت علی صدیقی	107/-
۲۴	مقالات صدیقی	مسلم صدیقی	66/-
۲۵	بادشاہ نصیرالدین حیدر	مرزا وجاہت حسین	42/-
۲۶	مقالات یوم نگم	اتر پردیش اردو اکادمی	5/-
۲۷	ناٹک ساگر	نور الٰہی و محمد عمر	163/-
۲۸	نوآئین ہندی	سید سلیمان حسین	12/-
۲۹	ہم قبیلہ	علی جواد زیدی	22/-
۳۰	ہندوستانی تہذیب	اقبال حسین	30/-
۳۱	رسالہ زمانہ	خورشید افسر بسوانی	22/-
۳۲	عصمت شناسی	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	248/-
۳۳	ادب پارے نثر	سید احتشام حسین	45/-
۳۴	ادب پارے نظم	سید احتشام حسین	45/-
۳۵	منتخب غزلیں	مجلس مشاورت	65/-
۳۶	منتخب نظمیں	مجلس مشاورت	60/-
۳۷	ملک زادہ منظور احمد	انور جلال پوری	263/-
۳۸	کلیم عاجز	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	173/-
۳۹	ندا فاضلی نمبر	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/-
۴۰	سید حامد	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	140/-

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں

ایس. رضوان، سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ 226010
فون وفیکس نمبر: 0522-2720683 وسیل ڈپو موبائل نمبر: 07081007078

Vol. 04 Issue 01
Dec 2020 -Feb 2021

Urdu Quarterly
Adbee Nasheman
Lucknow - 226 003

RNI No. UPURD / 2017 / 74845
Per Copy : 25/-
Annaul Subscription : 125/-

’ادبی نشیمن‘ قارئین کرام کی خدمت میں یوم جمہوریہ کی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

Printed,Published & Prop. by **Ahmad Rashiq** at **Nomani Printing Press, Baroodkhana, Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168, Almas Bagh, Hardoi Road, Lucknow **Editor: Dr. Saleem Ahmad**